ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

جولائی ۲۰۰۲ء

قرآنی نظامِ ربُوبیت کا پیامبر

درس قرآن کریم

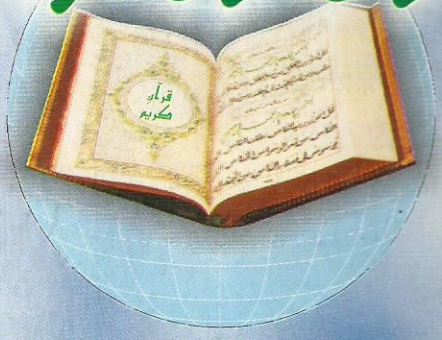

شعاعِ اُمیّد

منافقت

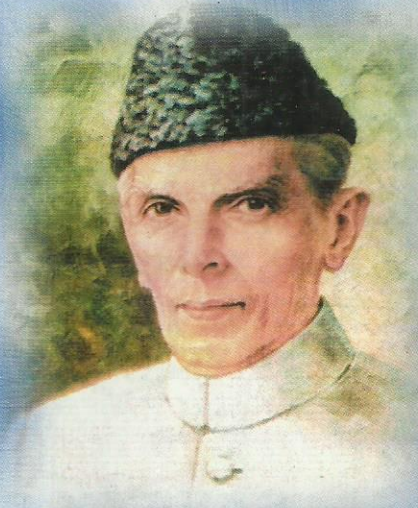

JOY OF LIFE

ہمارے قائدِ اعظم رح

تنقید

مجلّہ طلوعِ اسلام کا اجراء 1938ء میں علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر عمل میں آیا

قُرآنی نظامِ ربُوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدل اشتراک
سالانہ
پاکستان -/170 روپے
غیرممالک -/1000 روپے

خط وکتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵۔بی گلبرگ ۲ لاہور ۵۴۶۶۰
ٹیلی فون: 5714546-5753666
idara@toluislam.com

قیمت فی پرچہ
-/15 روپے

Bank Account Number 3082-7 National Bank of Pakistan, Main Market Gulberg Branch, Lahore.

جلد 55 | جولائی 2002ء | شمارہ نمبر 7

ایڈیٹر
محمد سلیم اختر

مجلس مشاورت
- ڈاکٹر صلاح الدین اکبر
- محترمہ شمیم انور

اکاؤنٹنٹ/ڈسپیچ کلرک ---- محمد زمرد بیگ
کمپوزر ---- شعیب حسین

انتظامیہ
چیئرمین ---------- ایاز حسین انصاری
ناظم -------- محمد سلیم اختر
ناشر ---------- عطاء الرحمٰن ارائیں

قانونی مشیر
- عبداللہ ثانی ایڈووکیٹ
- ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ
- محمد اقبال چوہدری ایڈووکیٹ
- اقبال ادریس ایڈووکیٹ

پرنٹرز: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ، لاہور-فون: 7232584

فہرست

لمعات	ادارہ	3
سورۃ النحل، درس چہارم، آیت 53	ادارہ	5
منافقت	علی محمد چدھڑ	25
ہمارے قائداعظمؒ	ڈاکٹر شبیر احمد، ایم ڈی، فلوریڈا	28
تنقید	ثریا کوثر قیصرانی	46
تبصرہ کتب	ادارہ	54
باب المراسلات	ادارہ	56

ENGLISH SECTION

Justice or Just Ice!

By Aboo B.Rana 61

Joy of Life

By Ms. Shamim Anwar 64

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لمعات

شُعاعِ اُمید

(قندِ مکرّر)

جب تمازت آفتاب اپنی انتہائی شدت پر پہنچ جاتی ہے۔ بادسموم کے شعلہ مزاج جھونکے ہر ذی روح کو جھلس کر رکھ دیتے ہیں۔ فضا میں برودت ورطوبت کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ زمین پر شگفتگی وبشاشت کا سراغ تک نہیں رہتا۔ سوختہ بخت کسان کی نگہ امید چاروں طرف سے خاسر ونامراد ہوکر' کاشانہ چشم میں لوٹ آتی ہے۔ دنیا آنے والی خشک سالی کے تصور سے کانپ اٹھتی ہے۔ اس کی امیدوں کا کوئی سہارا باقی نہیں رہتا۔ آرزوئیں سب پامال ہو جاتی ہیں۔ یاس ونا امیدی کشت مراد کے ہر گوشے پر مسلط ہو جاتی ہے۔ تو اس وقت۔۔ ہاں عین اس وقت۔۔ افق سے اس پار' ایک چھوٹی سی بدلی' درخشندہ امیدوں کی ہزار دنیائیں اپنے جلو میں لئے اٹھتی ہے اور اپنی گہر باریوں اور عنبر افشانیوں سے ہر سوختہ سامان کے دامن تہی کو امیدوں سے بھر پور کرتی یہ کہتی ہوئی آگے بڑھتی چلی آتی ہے کہ

فانظر الی اثار رحمت اللہ کیف یحی الارض بعد موتھا ﴿۳۰/۵۱﴾

ذرا اللہ کی رحمتوں کے آثار وشواہد پر غور کرو۔ وہ کس طرح زمین مردہ کو پھر سے زندگی کی بہاروں سے نوازتا ہے۔

یہ اس کا قانون ہے جس کے قانون میں کسی قسم کا تغیر وتبدل نہیں۔ یہ اس کا آئین ہے جس کے آئین میں کہیں کوئی کوتاہی نہیں۔ پھر جس طرح یہ قانون ابدی مٹی اور پتھر کی دنیا میں جاری وساری ہے' اسی طرح یہ آئین سرمدی انسانوں کی بستیوں پر بھی حاوی وطاری ہے' لہٰذا اگر آج پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کے سر پر مصائب ونوائب اور آلام وشدائد کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں' اگر انہیں بظاہر امید کا کوئی سہارا نظر نہیں آتا۔ اگر ان کے تمام سرے ایک ایک کر کے ٹوٹ چکے ہیں۔ تو ان کے لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں' ہمت ہار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ ان کے زندہ خدا کا وہی پائندہ قانون آج بھی موجود ہے اور ان سے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ

ولن یجعل اللہ للکفرین علی المومنین سبیلا ﴿۴/۱۴۱﴾

اور اللہ ہرگز کفار کو تم پر غالب نہیں آنے دے گا۔

لہٰذا اگر کفار کے ہاتھوں میں آج تکلیفیں پہنچی ہیں تو یہ اس لئے کہ ہم میں ایمان کی کمزوری آچکی تھی۔ ان کی یہ بالادستی مستقلاً نہیں رہ سکتی۔

اٹھو! ہمت کرو۔ اپنے عزائم میں بلندی' پاؤں میں استقامت' ایمان میں پختگی اور عمل میں درستی پیدا کرو اور پھر دیکھو کہ خدا کے یہ وعدے کس طرح پورے ہوتے ہیں کہ

واورثکم ارضھم و دیارمھم واموالھم وارضالم تطئوھا وکان اللہ علی کل شئ قدیرا (۳۳/۳۲)۔

ہم نے تمہیں تمہارے دشمنوں کی زمینوں کا' اور ان کے گھروں کا اور ان کے مال و دولت کا مالک بنا دیا اور (صرف ان ہی زمینوں کا نہیں جو تم سے چھینی ہیں بلکہ) ان زمینوں کا بھی جن تک ابھی تمہارے پاؤں نہیں پہنچے تھے۔ (یہ سطح بیں نگاہوں کو مشکل نظر آتا ہے لیکن) اللہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔

یہ محض موہوم امیدوں کی خیالی جنت نہیں' حقیقت ہے' اور ایک ایسی حقیقت جسے خدا نے مقدر کر دیا ہے۔

کتب اللہ لا غلبن انا ورسلی ان اللہ قوی عزیز ○ ..... الا ان حزب اللہ ھم المفلحون ○ (۲۲-۲۰/۵۸)۔

اللہ نے لکھ دیا ہے کہ یقیناً میں اور میرے رسول غالب رہیں گے (اس لئے کہ) اللہ قوی و غالب ہے' تو ان لوگوں کو جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں کبھی ایسا نہ پائے گا کہ وہ کسی ایسے شخص سے دوستی رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول (یعنی نظام حکومت خداوندی) کی مخالفت کرے۔ خواہ وہ انکے باپ ہوں یا ان کے بیٹے۔ ان کے بھائی ہوں یا ان کے گھرانے کے دیگر افراد۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے۔ وہ ان کی مدد کرے گا اور انہیں ان باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں تاکہ ان کی شادابی و سرسبزی میں کبھی فرق نہ آنے پائے' یہی وہ لوگ ہیں جن سے اللہ راضی ہوا اور وہ اپنے اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہی اللہ کا گروہ ہے اور دیکھو کامیابی اور کامرانی سب اس گروہ کے لئے مقدر ہے۔

یہ خدا کی طرف سے لکھا جا چکا ہے' یہ تمہارے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ اس نوشتۂ تقدیر الٰہی کو دنیا کی کوئی قوت نہیں مٹا سکتی۔ بس تم نے فقط اتنا کرنا ہے کہ اللہ کے گروہ میں شامل ہو جاؤ۔ تم یہ کرو اور پھر دیکھو کہ تمہاری ناکامیاں کس طرح کامیابیوں میں' ذلتیں عزتوں میں' ناامیدیاں امیدوں میں' نگوں ساریاں سرفرازیوں میں' شکست فتح میں اور موت' زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے' اور اللہ کا وعدہ اٹل ہوتا ہے۔

مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرّ کلیم و خلیل
اس کی زمیں بے حدود' اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج' دجلہ و دنیوب و نیل
مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الٰہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ النحل

(درس چہارم.....آیت 53)

قارئین کی خدمت میں سورۃ النحل کی آیت نمبر 53 کا درس نمبر 4 پیش خدمت ہے۔

دراصل یہ درس اسی پروگرام کی ہی ایک کڑی ہے کہ جس کے تحت بزم لاہور نے اپنے ہاں محترم پرویز صاحب کے آڈیو اور ویڈیو دروس کو قرطاس پر منتقل کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور جس کے تحت تادم تحریر خدا کے فضل و کرم سے 165 دروس کو صفحہ قرطاس پر لایا جا چکا ہے۔

جیسا کہ آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اگر کسی لیکچر کو تحریر میں پیش کرنا مقصود ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی کسی حد تک Editing Punctuation کی جائے لہٰذا اسی ضرورت کو پورا کرتے ہوئے Puntuation اور عناوین سازی کے اس مختصر سے عمل کے دوران یہ کوشش کی گئی ہے کہ محترم پرویز صاحب کی پیش کردہ فکر کسی شکل میں بھی متاثر نہ ہو، لیکن جو حضرات پرویز صاحب کے پیش کردہ دروس کو من و عن سننا چاہیں تو پرویز صاحب کی تمام دروس کی کیسٹس طلوع اسلام ٹرسٹ کے پاس محفوظ ہیں۔

آخر میں قارئین سے التماس ہے کہ وہ ان پیش کردہ دروس کے متعلق اپنی قیمتی آراء سے مطلع کریں۔ ادارہ طلوع اسلام آپ کی اس راہنمائی کا ممنون ہوگا۔

عزیزان من!

آج فروری 1977 کی 16 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورہ النحل کی آیت 53 سے ہو رہا ہے۔ 16/53 آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے پچھلے درس میں اور اس کے آخری لمحات میں یہ عرض کیا تھا کہ اب ہمارے سامنے ایک ایسی آیت آتی ہے جو عنوان بنتی ہے اس موضوع کا جو بالخصوص ہمارے اس دور میں بڑی اہمیت اختیار کر چکا ہے اور وہ موضوع ہے معاشی نظام یا معاشی مسئلہ۔

کمیونزم کا پس منظر

میں نے بتایا تھا کہ اس معاشی نظریہ کی جو اس دور میں عام ہو رہا ہے یا کیا جا رہا ہے، اس کی بنیاد مارکس کے تصور پر ہے اور اسے عام طور پر کمیونزم کہا جاتا ہے۔ اس نے کہا یہ تھا کہ یہ جتنی مصیبتیں، پریشانیاں، الجھنیں دنیا میں نظر آ رہی ہیں، یہ ضروریات زندگی یا رزق کی غلط تقسیم کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے۔ اس مسئلے کو اگر کسی طور پر حل کر دیا جائے تو یہ پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ اسی کو

وہ طبقاتی امتیاز بھی کہتا ہے' اسی کا نام اس کے نزدیک نظام سرمایہ داری کے خلاف ایک دوسرے نظام کا محاذ ہے' جیسا میں نے عرض کیا' کہ اسے کمیونزم کہتے ہیں۔ یہ جنگ ہے' یہ ٹکراؤ ہے ان دو نظاموں کے درمیان' دو نظریات کے درمیان' طبقات کے درمیان اور اس نے کہا کہ اگر اس مسئلے کا صحیح حل دریافت کیا جائے اور اسے رائج کیا جائے تو یہ الجھنیں' یہ تصادمات' یہ تزاحمات' یہ ٹکراؤ' ختم ہو جائیں گے اور امن قائم ہو جائے گا۔ جو کچھ اس نے لکھا اور کہا اس کے مطابق بنیادی نظریہ اس کا یہ ہے کہ اصول یہ ہونا چاہئے کہ:

From each according to his capacity and to each according to his needs.

ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے۔ نظریہ بڑا خوشگوار' اطمینان بخش اور پسندیدہ تھا لہٰذا اس کی پارٹی کے اندر اس پر تفصیلی Discussion ہوئی جس کی Details بھی موجود ہیں۔ بہر حال اس کو کہا گیا کہ اس کو رائج کرنے کا طریق کیا ہونا چاہئے؟ تو اس نے کہا کہ یہ نظریہ تو میں سمجھ گیا ہوں کہ اسی پر انسانیت کی فلاح کا دارومدار ہے لیکن میں یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ عمل میں کیسے آ سکتا ہے۔ یعنی یہ بات کہ ایک شخص اپنی capacity کے مطابق' (capacity کو آپ صلاحیت' استعداد' استطاعت' کچھ بھی کہہ لیجئے) کام کرے' اس کام کا جو ماحصل ہو جسے وہ پیداوار کہتے ہیں' وہ خواہ اس کی ضروریات سے کہیں زیادہ فاضلہ ہو لیکن اسے دیا جائے اس میں سے اتنا ہی کہ جس سے اس کی ضروریات پوری ہوتی ہوں اس کے علاوہ' اس سے جتنا زائد ہو وہ اس سے لے لیا جائے' چھین لیا جائے' تو اس سے کہا کہ اس کے بعد وہ اتنا کام ہی کیوں کرے گا کہ اس کو زائد پیداوار ہو وہ اتنا ہی کام کرے گا جس سے اس کی ضروریات پوری ہوں۔ جب اسے اس سے زیادہ کچھ ملنا ہی نہیں تو وہ جان مار کر کام کیوں کرے گا؟

جذبہ محرکہ کیا ہو؟

اس نے کہا کہ میرے نزدیک' حل تو یہی ہے انسانوں کی اس پریشانی کا لیکن عملاً اس کو رائج کرنے کے راستے میں رکاوٹ یہ پیش آتی ہے کہ وہ Insensitive وہ جذبۂ محرکہ کیا ہو جس کی بنا پر ایک شخص جان مار کر کام کرے اور اپنی ضرورت کے اعتبار سے اس میں سے لے' اور باقی سارا اس سے لے کر' دوسروں کو دیا جائے' وہ کیوں کام کرے؟ تو اس نے کہا یہ تھا کہ یہ کیوں' جو ہے اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ اس لئے میں اسے عملاً رائج کرنے کا کوئی راستہ نہیں بتا سکتا۔ برسبیلِ تنزل اتنا ہی ابھی کیا جا سکتا ہے یہ جسے آپ سوشلزم یا اشتراکیت کہتے ہیں' یہ کمیونزم سے الگ چیز ہے۔ یوں کہیے کہ اس کا ابتدائی سٹیج ہے یا یوں کہیے کہ جہاں جا کے مارکس عاجز آ گیا تھا' اس کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لئے اس سے وہ پیچھے ہٹا۔ اور اس نے کہا یہ کہ ابتداً تو یوں کیا جائے کہ جتنے بھی یہ وسائلِ پیداوار ہیں means of production خواہ وہ زمین کی شکل میں ہوں' کارخانوں کی شکل میں ہوں وہ (individual property) 'انفرادی ملکیت میں نہ رہیں۔ وہ قومی ملکیت میں لے لیے جائیں۔ جسے ہم آج نیشنلائز کہتے ہیں اور اس کے بعد ہر شخص کو کام مہیا کیا جائے۔ اور کام مہیا کرنے کے بعد اس کو اس کی wages دی جائے' مزدوری دی جائے مزدور کو۔ اس نے کہا کہ یہ ہے وہ عملی نظام جسے ہم ابتدائی طور پر رائج کر سکتے ہیں۔ یعنی wages کا نظام۔ according to his needs انہیں مزدوری کی اجرت دی جائے۔ اس نے کہا کہ اسے تو ہم نافذ کر

سکتے ہیں۔

سوشلزم اور کمیونزم میں فرق

یہ جو ہے نابر سبیل تنزل نافذ کیا گیا' اسے سوشلزم کہا جاتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ یہ پہلا قدم ہے بہرحال آپ دیکھ لیجئے دونوں میں کتنا فرق ہے۔ یہ ہے جسے اشتراکیت کہا جاتا ہے' سوشلزم کہا جاتا ہے۔ میں نے جیسا عرض کیا تھا اور یہ میں نے ہی نہیں کہا خود اس کی پارٹی کے اندر یہ اعتراض ہوا کہ یہ تو کیپٹل ازم کی ہی ایک ذرا سی بدلی ہوئی شکل ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ اسے ویلفیئر کہہ سکتے ہیں۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ مزدور کی محنت کا معاوضہ متعین کرنے کا اصول اور معیار کیا ہو۔ یعنی ایک لیبر' ایک مزدور وہ بھی دن بھر کام کرے۔ ایک راج' معمار وہ بھی اس کے ساتھ دن بھر کام کرے' ان کے اوپر supervision کے لئے ایک انجینئر بھی دن بھر کام کرے۔ معمار کو پانچ روپے یا تین روپے۔ اس زمانے میں تو دو ہی روپے یا ایک روپیہ ہی بڑا پڑتا تھا۔ معمار کو مثلاً دس روپے' انجینئر کو ساٹھ روپے' تو انہوں نے کہا' یہ کس معیار کے مطابق متعین کیا جائے۔ انہوں نے کہا Capitalism بھی تو یہی کرتا ہے۔ وہ ایک فرد ہوتا ہے کارخانے کا مالک' وہ یہ کہتا ہے کہ میرے کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کو مثلاً سو روپیہ مہینہ ملے گا کیونکہ لیبر اس کے اوپر آئے گی۔ ان کو ہم دو سو روپیہ دیں گے۔ انجینئر کو ہم ہزار روپیہ دیں گے۔ اس نے کہا بعینہ یہی کچھ ہم کرتے تھے اپنے ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں ایک مالک ہوتا ہے کارخانے کا۔ اس میں تم نے اس کی جگہ سٹیٹ کو مالک مقرر کر دیا۔ وہاں وہ ایک مالک Wages متعین کرتا تھا' یہاں سٹیٹ نے مقرر کر دیں۔ تو جہاں تک اس مزدور کا تعلق ہے ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ یہ تو ان کے اعتراضات تھے۔ اور یہ اس بات حد تک بات بڑھی کہ وہ اس کی بنیاد پر ساتھ چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ اور اس کے بعد عملاً لینن نے آ کر یہ سوشلزم نافذ کیا۔ دنیا میں کمیونزم آج بھی کہیں نافذ نہیں ہے۔ آج بھی کمیونسٹ جو ہے وہ یہی کہتا ہے جو مارکس نے کہا تھا کہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس کے لئے جذبۂ محرکہ کیا ہو۔ کیوں جان مارکر ایک شخص کام کرے جب اسے پتہ ہے کہ میں جو کام کروں گا اس کے محاصل میں سے مجھے اتنا تھوڑا سا ملے گا' باقی نہیں مجھے ملے گا۔ وہ کہتے ہیں ہمارے پاس بھی اس کا حل نہیں ہے۔ اور اسی لئے سوشلزم ہی نافذ ہے۔

اگرچہ اس کی بھی یہ کیفیت ہے کہ وہ Russia میں تو قریب قریب فیل ہو چکا ہے۔ اور چائنہ میں ابھی introduce ہوا ہے اور اس کی وجہ ساری یہ ہے کہ یہ نظام جو ہے' یہ وہی ہے جو capitalism کا نظام ہے۔ اس میں تو صرف مالک بدلتا ہے' فرد کی بجائے ایک سٹیٹ کا absolute آئیڈیا آپ لوگوں نے رکھ لیا سوائے اس کے کہ یہ صرف جس میں صاحب اقتدار لوگوں کا ایک گروپ ہوتا ہے اور کوئی فرق نہیں ہے ان میں سوا اس بنا پر یہ نہیں چل سکتا لہٰذا وہاں جب تک لینن برسر اقتدار رہا اس کی پرسنیلیٹی اتنی بڑی تھی کہ اس سے وابستگی کی بنا پر وہ لوگ یہ نظام چلاتے رہے۔ اس کے مرنے کے بعد ایسی پرسنیلیٹی وہاں کوئی نہیں رہی۔ یہ پرسنیلیٹی cult ہے جس کی بنا پر یہ نظام چلا۔ اس کے بعد چائنہ میں ماؤزے تنگ اور اس کے ساتھی جو ہیں ایک آدھ ان کی پرسنیلیٹی ہے لیکن ماؤ کو بھی اس کیوں کا جواب نہ ملا دراصل اس کا حل تو وہی ہے جو 1400 سال پیشتر قرآن نے پیش کیا تھا لہٰذا یہ حل مارکس کے ذہن کی اختراع نہیں تھا۔ نبی اکرمؐ نے تو اسے

عملاً کر کے دکھا دیا تھا جس کی بنا پر یہ کچھ ہوتا ہے' ماؤ نے یہ کہا۔ بات جو کہی گئی ہے وہ اس میں جو میں نے عرض کیا تھا' ہے وہی حل۔ وہ کیوں کا جواب اسے نہیں ملتا۔

قرآن اور معاشی مساوات کا نظریہ

آپ کو معلوم ہوگا کہ جب وظائف مقرر ہوئے ہیں' وظائف کے معنے یہ تھے کہ پوری کی پوری امت' پوری قوم کام کرتی تھی جو کام پروگرام کے مطابق دیا جاتا تھا انہیں' اور ہر ایک کو اتنا دیا جاتا تھا سٹیٹ کی طرف سے اسے وظائف کا نام دیا گیا ہے۔ یہ جو دیا گیا تھا' اس کا معیار کیا تھا۔ اس کا معیار تھا ہر فرد کی ضروریات۔ یہ وہ عملاً کیا تھا نبی اکرم ﷺ نے۔ حتیٰ کہ میدان جنگ میں جو مال غنیمت ہوتا ہے وہ تو ساری فوج کا مشترکہ ہوتا ہے' اس میں بھی تقسیم کا یہ اصول تھا کہ جو مجرد ہوتا تھا' شادی شدہ نہیں ہوتا تھا' اس کا حصہ کم ہوتا تھا اور شادی شدہ اور بچے والے' بال بچوں والا جو تھا اس کا اس میں بھی حصہ اس کی ضرورت کی مطابق ہوتا تھا۔ وظائف متعین اس اصول سے کئے گئے تھے کہ ساری امت کے افراد کام کریں' اس پروگرام کے مطابق جو وہ نظام چاک آؤٹ کرے۔ اور ہر ایک کی ضروریات کے مطابق' اسے وظیفہ دیا جائے۔ سٹیٹ کی طرف سے یہ چیز اس کو دی جائے۔ اب سوال یہ تھا کہ 'کیوں' کا جواب کیا وہاں دیا گیا ہے؟ یہی بنیاد ہے اس سارے مسئلے کی۔ اور قرآن میں وہ تو 'کیوں' کے بغیر کوئی حکم ہی نہیں دیتا۔ وہ کیوں جو تھا اسے اس نے بتایا ہے اور یہ ہے وہ چیز جہاں میں یہ کہتا ہوں کہ جو قوم بھی اس قرآن کے اوپر آ گئی اور اس نے کیوں کا جواب اس سے پا کر اس کے متعلق ایک معاشرہ متشکل کرے گی تو دنیا کی مصیبتوں کا حل اس قوم کے ہاتھ سے ہوگا۔ بات وہی ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ کہ اس دور میں دوبارہ مارکس کے ریفرنس سے وہ بات آگے چلی ہے وہ تو قرآن کے ریفرنس سے آگے بات چلتی۔ بنیاد ہے اس چیز کی' اس ایمان پر کہ ان چار لفظوں سے جہاں سے یہ سورہ النحل کی 53 ویں آیت شروع ہوتی ہے۔

وما بکم من نعمة فمن اللہ

یہ ہے عزیز ان من سارا بنیادی نکتہ اس کے اندر۔ چار لفظ ہیں سارے۔ نعمت کے معنے ہوتے ہیں ہر قسم کی خوشگواریاں' سہولت کا سامان' رزق کا سامان' ضروریاتِ زندگی' جتنی چیزیں آپ کہہ سکتے ہیں۔ اس میں سہولتیں بھی ہوتی ہیں' سرفرازیاں بھی ہوتی ہیں' عجیب جامع لفظ ہے عربوں کے ہاں یہ۔ کہ جس قدر بھی زندگی کے لئے ضروریات ہیں انسان کی نشوونما کی۔ مثلاً افراد کے لئے جو جو بھی ضروریات ہیں وہ بلا مزد و معاوضہ خدا کی طرف سے ملی ہوئی ہیں۔ سامانِ رزق حاصل ہوتا ہے نظامِ فطرت سے۔ زمین' پانی' ہوا' حرارت' روشنی وہ کہتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی چیز کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ **فمن اللہ**۔ یہ تو خدا کی طرف سے ہے۔ بہت اچھا۔ اب آیا انسان وہ کہتا ہے کہ اس کے اندر بھی جتنی صلاحیتیں ہیں' وہ صلاحیتیں بھی اس نے نہ یہ کہیں سے خریدیں ہیں' نہ یہ کہیں سے اس نے مانگ کر لی ہیں۔ یہ تو اس کی ہیں ہی نہیں یہ بھی تو خدا کی ہی طرف سے انسان کو ملی ہیں۔ انسان کا ذہن اس کے کام کرنے کی صلاحیتیں' اس کی سوچ' کوئی چیزیں aquire یا achive کرنے کی استعداد۔ یہ جتنی استعداد ایک فرد کو حاصل ہے basically بنیادی طور پر وہ کہاں سے اس نے لی ہیں۔

وہ تو انسانی بچے کو پیدائش کے ساتھ ملتی ہیں۔ اس میں development' اس میں growth' اس میں ترقی یہ ٹھیک ہے کہ جو باہر کا نظام ہے اس کی رُو سے ہوتی ہیں۔ بنیادی طور پر تو یہ ساری چیزیں جتنی بھی ہیں' وہ کہتا ہے **فمن اللہ**۔ یہ تو اس کی طرف سے ملی ہوئی ہیں۔ یہ ذہن جو ہمارا اتنا سوچ رہا ہے' کہاں سے حاصل ہوا ہے ہمیں۔ یہ ہماری فکر کا سرچشمہ جو ہے کہاں سے لیا ہے ہم نے اسے۔ یہی تو ہے جہاں آ کر فرق پڑتا ہے ایک فرد اور دوسرے فرد میں۔ یہ جسے آپ صلاحیتیں کہتے ہیں کام کرنے کی۔ یہی تو بنیاد ہے نا اس کے فرض کی کہ وہ زیادہ intellect کا مالک ہے' اس کی سوچ بہت اونچی ہے یہ جو ہے یہ lower level کے اوپر ہے۔ میں اب اس سوال میں نہیں جاتا کہ یہ جو تفاوت ہے اس تفاوت کی بنیاد کیا ہے۔ لیکن یہی ہے نا فرق جو آپ کہتے ہیں۔ اس کے بعد اگلی چیز جو ہے وہ تو حاصل کرنے کی چیز ہے۔ انجینئر نے فن انجینئرنگ جو تھا' علم حاصل کیا۔ اس سے اس کو ان چیزوں کی واقفیت ہوئی۔ مزدور نے حاصل یہ نہیں کیا۔ بات آگے پھر وہیں چلی جاتی ہے سرمایہ داری کی۔ انجینئر کا باپ امیر آدمی تھا وہ اپنے بیٹے کو بھیجتا تھا ولایت۔ مزدور کا باپ غریب آدمی تھا۔ یہ نہ تعلیم دلا سکا نہ اس کو ولایت بھیج سکا' یہ انجینئر نہیں بن سکا۔ یہ بھی اس کا قصور نہیں ہے' وہ بھی اس کی کاریگری نہیں ہے۔ یہ بات اور طول کھینچ جاتی ہے لیکن قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ جو منبع ہے' سرچشمہ ہے صلاحیتوں کا' جسے انسانی فکر اور دماغ اور یہ صلاحیتیں جسے آپ کہتے ہیں یہ جو basically اس کے اندر صلاحیت ہے اس چیز کو اخذ کرنے کی' یہ کہاں سے لی ہے اس نے۔ بنیاد یہ ہے **وما بکم من نعمۃ فمن اللہ** یہ ہے پہلی چیز۔ **فمن اللہ** یہیں پہ ایک بات میں واضح کرتا جاؤں۔

Faith کسے کہتے ہیں؟

یہ کمیونسٹ سے سوال کیجئے تو وہ کہتے ہیں کہ صاحب یہ تو بہرحال آپ کا ایمان ہے ناں۔ جس کو آپ انگریزی میں Faith کہتے ہیں۔ یہ تو faith کے اوپر ایک بات مبنی آپ نے کر دی۔ تو بنیاد آپ نے faith پر رکھی۔ ہم تو نہیں اسے مانتے۔ سمجھا یوں جاتا ہے کہ واقعی یہ faith مذہب پرستوں کی بات ہے۔ ان کے ہاں نہیں ہے۔ ذرا غور کیجئے۔ ایک مذہب پرست کا یا ایک مسلمان کا faith ہے کہ خدا ہے۔ خدا کی طرف سے وحی ملی۔ وحی نے یہ اقدار دیں' یہ اصول دیئے' یہ قوانین دیئے' جنہیں ہم یہ تسلیم کرتے ہیں اور ان کو تسلیم کرنے کے بعد ہم ایک گروپ سے belong کرتے ہیں ایک امت کے فرد بنتے ہیں۔ یہ بنیاد جو ہے اسے faith کہتے ہیں۔ میں پوچھتا یہ ہوں کہ کمیونسٹ بننے کے لئے بھی اس faith کی ضرورت ہے یا نہیں۔ faith اور faith میں فرق ہے۔ ان کے ہاں بنیاد یہ ہے کہ خدا کوئی نہیں۔ وحی نہیں ہے۔ مستقل اقدار کوئی نہیں ہیں۔ مستقل قوانین کوئی نہیں ہیں۔ یہ نہیں ہیں۔ یہ جو ماننا ہے کہ یہ نہیں ہیں یہ faith نہیں ہے؟ اتنا متشدد faith کہ ہمارے ہاں تو اس faith کی اب کوئی قیمت ہی نہیں رہی' کوئی اہمیت ہی نہیں رہی' مسلمان کہلوا لیجئے۔ اس کے بعد خدا کا انکار کیجئے' وحی کا انکار کیجئے' اصولوں کا انکار کیجئے' رسالت کا انکار کیجئے' مسلمان کہلاتے رہیئے' کوئی نہیں پوچھتا۔ ان سے کہیے حضرت ذرا Russia میں جایئے اور کمیونسٹ پارٹی کو belong کیجئے اور وہاں جا کے کہیے کہ صاحب میں کمیونسٹ تو ہوں لیکن میں خدا کو مانتا ہوں' وحی کو مانتا ہوں پوچھے دوسرے دن وہاں رہنے دیا جائے گا آپ کو؟ کوئی کمیونسٹ پارٹی آپ کو اپنا ممبر نہیں بنائے گی آپ کو اگر آپ نے یہ

کہہ دیا کہ صاحب میں خدا کو مانتا ہوں۔ جس طرح اگر آپ کہہ دیں کہ میں خدا کو نہیں مانتا تو قرآن کی رو سے آپ مسلمان گروپ کے ممبر نہیں ہو سکتے۔

اسے کہتے ہیں article of faith کمیونسٹ گروپ کے اندر آپ جانے کے لئے یا جانے کے بعد یا کہہ دیجئے کہ میں خدا کو مانتا ہوں۔ آپ اس گروپ کے ممبر ہی نہیں رہ سکتے۔ کوئی خدا کو ماننے والا کمیونسٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ وحی کا ماننے والا کمیونسٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور یہ وہ چیز ہے جو وہ کہتے ہیں ??? it is an article of faith کمیونسٹ کا article of faith ہے۔ ان کا یہ اب وہ لفظ ہمارے ہاں ایمان ہی آئے گا۔ یہ قرآن نے جو کہا ہے' طاغوت پہ بھی تو وہ ایمان کہتا ہے۔ یہ طاغوت پہ ایمان ہے۔ دوسری طرف وہ خدا پہ ایمان ہے۔ اللہ پہ ایمان ہے۔ ایمان ہونے کی جہت سے تو دونوں یکساں نظر آتے ہیں۔ بات سمجھ لی آپ نے کیا؟ میں کہہ رہا ہوں کہ faith faith تو وہاں بھی ہے۔ یہ کہیے گا ان سے کہ ٹھیک ہے جی آپ وہ faith نہیں رکھتے جن چیزوں میں ہم faith رکھتے ہیں۔ faith تو تمہارا بھی ہے۔ لہٰذا یہاں کبھی ہمیں apologatic attitude نہیں اختیار کرنا چاہئے۔ معروضی انداز نہیں ہونا چاہئے کہ جی ہاں صاحب' ٹھیک ہے جی' ہم تو مذہب پرست ہیں جی' ہم تو مانیں گے جی' اب کیا کریں مسلمان کے گھر میں جو پیدا ہو گئے۔ مصیبت ہے ہمارے لئے تو۔ مصیبت کیا ہے۔ ان سے کہیے ٹھیک ہے' میں یہ faith چھوڑنا چاہتا ہوں' میں کمیونسٹ ہونا چاہتا ہوں۔ بتایئے پہلے مجھے بنیادی طور پر بتایئے کہ مجھے کیا ماننا ہوگا؟ ماننا ہوگا۔ کمیونسٹ ہونے کے لئے بنیادی طور پہ ان کے ہاں لکھا ہے کہ یہ یہ ماننا ہوگا۔ کہ یہ جی اگر میں نہ مانوں تو۔ وہ کہتے ہیں تم کمیونسٹ نہیں ہو سکتے۔ تو صاحب یہ ماننا ہوگا جسے آپ کہتے ہیں وہی تو ہم کہتے ہیں کہ آپ کو یہ ماننا ہوگا۔ کیا ماننا ہوگا؟ ماننا ہوگا کہ **ومابکم من نعمت فمن اللہ** یہ ماننا ہوگا۔ کہ جتنی capacity دی ہوئی ہے' کام کرنے کی صلاحیتیں بنیادی جو ہیں' میری نہیں ہیں۔ means of production جتنے بھی ہیں' وسائل پیداوار میرے تیرے کسی فرد کے نہیں ہیں۔ **فمن اللہ**۔ یہ میرا ایمان ہے۔ تمہارا ایمان ہے ناں کہ اس پہ فرد کی ملکیت نہیں' سٹیٹ کی ملکیت ہے۔ یہ ہے نا کمیونسٹ کا ایمان۔ میرا ایمان یہ ہے کہ یہاں فرد بھی نہیں' سٹیٹ بھی کوئی شے نہیں۔ یہ خدا کی ملکیت ہے۔ تو پوچھتے ہیں صاحب معنی اس کے کیا ہیں کہ یہ تو صاحب ایک abstract سی چیز ہے۔ نظری سی چیز ہے۔ کہ صاحب نظری سی چیز تو نہیں ہے۔ سٹیٹ کی ملکیت کے معنے یہ ہیں نا کہ جو بھی وہ قوانین بنائے اس ملکیت سے فائدہ اٹھانے کے لئے' اس کو حق حاصل ہے یہ قوانین بنانے کا' کیونکہ یہ اس کی ملکیت ہیں۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ صاحب یہ خدا کی ملکیت ہے اس لئے اس کو حق حاصل ہے کہ اس ملکیت سے فائدہ اٹھانے کے لئے جو قوانین چاہے بنائے۔ انہی قوانین کو ہم وحی کہتے ہیں۔ سٹیٹ کے قوانین جو ہیں' ان کا ماننا آپ کے نزدیک وہ تو faith کوئی بری بات نہیں ہے۔ نہایت معقول بات ہے اور اگر ہم یہ کہیں کہ صاحب جسے آپ سٹیٹ کہتے ہیں ہم اس کی جگہ خدا کو مالک قرار دیتے ہیں۔ سٹیٹ کو جو اختیار حاصل ہیں ہمارے نزدیک' ان کا خدا کو اختیار حاصل ہیں۔ سٹیٹ جو اختیارات تمہارے ہاں کے ضوابط قوانین میں آتے ہیں' خدا کے اختیارات ہمارے نزدیک خدا کی کتاب میں آتے ہیں۔ بتاؤ تو سہی basically دونوں میں فرق کیا ہے؟ ہمیں مطعون کرتے ہو اور آپ بڑے rationalist بنتے ہو۔ ہمارے

ہاں بات سمجھی ہوئی نہیں ہے۔ اسی لئے کچھ جھینپے ہوئے سے، شرمندہ ہوئے ہوئے سے، کہ ہاں صاحب ٹھیک ہے۔ جی ہم یہ مانتے ہیں، جی یہ ٹھیک ہے، ہم مسلمان تو ہوئے۔ ان سے کہو کہ فرق کیا ہے تمہارے ماننے اور ہمارے ماننے میں۔ یہ بات الگ ہے کہ تم کیا مانتے ہو، ہم کیا مانتے ہیں۔ میں نے بتایا آپ کو ایک ایک قدم کے اوپر آپ دیکھیں گے کہ وہ وہی کچھ وہ کرتے ہیں۔ بنیاد یہ ہے کہ تم یہاں تک صرف جاتے ہو کہ وسائل پیداوار پر ملکیت صرف سٹیٹ کی ہے۔ چلیے صاحب سٹیٹ کو یہ اختیار ہے وہ قوانین بنائے۔ بہت اچھا صاحب کہ یہ جو یہ نظریہ اور یہ ایمان رکھنے کے باوجود آپ وہ جو خود تمہارے ہاں کے مارکس کا دیا ہوا بنیادی اصول ہے اسے تو آپ قابل عمل نہیں قرار دیتے نا۔ یہ سارا کچھ ماننے کے باوجود آپ کہتے ہیں کہ اس پر ہم عمل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جذبۂ محرکہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اور ہم اتنا ماننے کے بعد اگلا قدم یہ دیتے ہیں، جذبۂ محرکہ تو یہاں سے پیدا ہوا۔ یہ ٹھیک ہے خدا نے یہ کہا کہ الارض للہ بھی ہے، وسائل پیداوار خدا کے ہیں۔ وہ تو باہر تک کی دنیا کا اس نے یہ معاملہ کیا۔

اسلام: نہ اشتراکیت نہ سرمایہ داری

یہ جو ہے **وما بکم من نعمة فمن الله**۔ میرے اندر جو صلاحیتیں ہیں اتنی کہ میں زید کے مقابلے میں زیادہ پیدا کر سکتا ہوں۔ میری یہ زائد صلاحیت جو ہے یہ بھی میری نہیں ہے خدا کی عطا کردہ ہے۔ جس طرح زمین میری نہیں ہے خدا کی عطا کردہ ہے۔ یہ ہے ایمان ہمارا۔ تمہارا ایمان وہاں پر ختم ہو گیا جو سٹیٹ کی ملکیت میں آیا۔ تم نے خود اعتراف کیا کہ وہ تو capitalism کی ایک بدلی ہوئی ذرا شکل ہے۔ ہمارا ایمان یہ ہے آپ دیکھئے کہ یہاں نہ capitalism رہتا ہے نہ تمہارے ہاں کی سوشلزم رہتی ہے۔ یہ اس سے بہت آگے چلی جاتی ہے بات۔ زمین بھی خدا کی، میرے اندر زمین سے پیدا کرنے کی صلاحیتیں جو دی ہوئی ہیں وہ بھی اس کی دی ہوئی ہیں۔ میں نہ اس کا مالک ہوں، نہ میں ان کا مالک ہوں۔ اس میں میرا کیا ہے۔ عزیزان من! مجھے افسوس یہ ہے، نہ تو آپ احباب کے سامنے قرآن کے نسخے ہوتے ہیں نہ ہی آپ ان کے کچھ نوٹس رکھتے ہیں۔ کچھ لئے چلے جایئے اگر کام کی کوئی باتیں آ جاتی ہیں۔ پتہ ہے زندگی کتنی ہے دوبارہ یہ وقت آنے ہیں یا نہیں آنے۔ یہ صلاحیتیں basically یہ میری نہیں ہیں۔ یہ وسائل پیداوار یہ میرے نہیں ہیں۔ فرد کا کیا ہے؟ میں اس وسائل پیداوار کو خدا کی دی ہوئی صلاحیتوں کے مطابق جا کے کام کرتا ہوں، محنت کرتا ہوں دوسرا نہیں کرتا یہ ہے فرق اور اس نے کہا ہے کہ **لیس للانسان الا ماسعی**، فرد صرف اس کا مالک ہے جس کی جو وہ محنت کرتا ہے اپنی۔ یہ اس کی ہے، کہا یہ چاہتے ہو نا کہ تم سے عدل ہو، عدل کا تقاضہ ہے کہ **لیس للانسان الا ماسعی**، صرف اس کی جو لیبر ہے، محنت ہے اس کی، یہ ہے اس فرد کی اور اسی کا یہ مالک اپنے آپ کو کہہ سکتا ہے justice کا یہ تقاضہ ہے۔ as of right بطور حق اس سے زیادہ ڈیمانڈ نہیں کر سکتا، بات بڑی صاف ہے۔ اس ایمان کے بعد کہ زمین بھی، خدا کی اس میں زیادہ پیدا کرنے کی صلاحیتیں جو مجھ میں ہیں یہ بھی اس کی دی ہوئی ہیں۔ بس میرا اس کے اندر صرف اتنا ہی رہ جاتا ہے **لیس للانسان الا ماسعیٰ** 53/39 میاں صاحب! یہ ہے آپ کا، لیجئے۔ as of right تو یہی لے سکتے ہیں۔ لیکن اس نے کہا ہے کہ ہم نے عدل کے ساتھ احسان کا بھی حکم دیا ہے۔ ہم صرف عدل نہیں کرنا چاہتے۔ اور وہ احسان یہ

ہے کہ **وما من دآبۃٍ فی الارض الا علی اللہ رزقھا** 11/6 تمہاری ضروریات زندگی پورا کرنا' مہیا کرنا یہ ہمارا فریضہ ہے۔ کہا' عدل پہ رہنا چاہتے ہو یا ہمارے احسان پہ آنا چاہتے ہو۔ یہ ہمارے ذمے ہے۔ یہ وہ جو **ماسعی** کا تھا حوالہ اس کا ہے 53/39 یہ جو کہا ہے کہ اس روئے زمین پر کوئی جاندار ایسا نہیں ہے کہ جس کی رزق کی ذمہ داری ہمارے اوپر نہ ہو 11/6۔ دیکھتے ہیں اب کیسے کڑیاں ملتی چلی جاتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کون سا نظام چاہتے ہو' یہ نظام چاہتے ہو یا وہی چاہتے ہو تم' ٹھیک ہے جتنی تم محنت کرتے ہو اس سے اگر تمہارے بال بچوں کا پیٹ نہ بھرے تو پھر ہمارے ذمے تو کوئی دوش نہیں ہے جسے کہتے ہیں۔ اور ہم آگے بڑھتے ہیں اس سے' ہم تمہارے اور تمہارے بال بچوں کے رزق کے ذمے دار ہیں' ہم دیں گے۔ اور اس کے بعد اگلی چیز یہ آ گئی کہ پھر سیدھی سی بات ہے کہ جو کام تمہارے ذمے لگایا جائے وہ کام تم کرو۔ صلاحیتیں جو تمہیں ہم نے دی ہیں ان صلاحیتوں کو اس کام کے پورا کرنے میں صرف کرو تو بڑھتے چلے جاؤ۔ تمہارا اتنا ہی کام ہے اس کے بعد کی فکر تو ہے ہی نہیں تمہاری

؎ جو غم ملا اسے غم جاناں بنا دیا

یہ سب تو کرتے رہو۔ گھر آؤ گے' تمہارے گھر میں سب کچھ موجود پاؤ گے تم۔ جو تمہارے اور تمہارے بچوں کی ضروریات کے لئے ضروری ہے' یہ موجود پاؤ گے۔ پھر اس کے بعد کیا ضرورت ہے یہ سر درد اپنے ذمہ لے کہ میں نے کیا کام کیا' کیا محنت ملی' کیا پیدا ہوا' کہاں رکھوں' کسے بیچوں۔ ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ کام مجھے دیا ہے میں نے کر دیا ہے۔ میں کر کے آ گیا۔ گھر میں سب میری ضروریات زندگی پڑی ہوئی ہیں۔ کہیے insentive مل گیا یا نہیں۔

جذبۂ محرکہ: ذات کی نشوونما

اور اگلی بات اس نے پھر اور کہہ دی کہ اس بات پر پھر ایمان رکھو کہ یہ ضروریات زندگی تمہاری صرف جسم کی ضروریات ہی نہیں' تمہارے اندر ایک اور چیز بھی ہے کہ جسے انسان کی ذات کہا جاتا ہے۔ انسان کی ذات کی نشوونما بھی ضروری ہے۔ جسم کی نشوونما سے کہیں زیادہ ضروری۔ اور اس ذات کی نشوونما کا اصول یہ یاد رکھو' اس پہ ایمان لاؤ کہ میرے جسم کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جو میں کھاتا ہوں جو میں لیتا ہوں۔ ذات کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جو میں دوسرے کی ضرورت کے لئے دیتا ہوں۔ اب جتنا زیادہ سے زیادہ دوسرے کی ضرورت کے لئے دو گے' اتنا ہی زیادہ سے زیادہ تمہاری ذات کی نشوونما ہو جائے گی۔ تمہاری ضروریات کے متعلق تو ہم نے انتظام کر دیا۔ طبعی ضروریات کو ہم پوری کریں گے۔ اپنی ذات کی نشوونما تم خود کرو گے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیدا کرو اور زیادہ سے زیادہ دوسرے کی ضروریات کے لئے دیتے چلے جاؤ۔ ذات کی نشوونما خود کرو' تمہاری تمہارے بچوں کی نشوونما ہم کریں گے۔ کہیے عزیزان من! وہ insentive وہ جذبۂ محرکہ جو مارکس کو نہیں مل سکا تھا اور جس کی وجہ سے اس نے کہہ دیا تھا اور یہ میں سمجھتا ہوں اس کی دیانت کا تقاضہ جو اس نے کہہ دیا' اعتراف کر لیا اتنے بڑے آدمی نے کہ میں نہیں یہ کر سکتا۔ اور یہ واقعہ تھا کہ نہیں کر سکا۔ یہ تھا وہ ایمان جس کی بنیادوں کے اوپر یہ معاشی نظام استوار ہوا تھا۔ یہ تھا وہ ایمان جس کی بنیاد کے اوپر جب وظائف ملے ہیں اور اس کو جو کم ملا ہے' کم اس اعتبار سے اس

کی quantity ناپی جائے اور ساتھ والا جو تھا' بال بچوں والا اس کو زیادہ ملا ہے۔ کم والے نے یہ نہیں کیا کہ باقی عمر جو ہے وہ کہے میں تو دو گھنٹے ہی کام کروں گا مجھے کیا ضرورت پڑی ہے سارا دن جان مارتا پھروں۔ وہ بھی اسی طرح جان مارتا تھا جس طرح یہ جان مارتا تھا۔ کیونکہ اس جان مارنے کے عوض میں جو کچھ پیدا ہو رہا تھا جو زیادہ سے زیادہ دوسرے کو دیا جا رہا تھا' اس سے ان کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ یاد رکھو زیادہ سے زیادہ جو دوسروں کو دینا ہے یہ تزکیہ نفس تمہاری اس سے ہو جاتی ہے۔ integration of your ownself۔ لفظ بھی تثبیت ہے عزیزان من۔ ثبات سے جو لفظ نکلتا ہے۔ تو کہا کہ یہ ہے جذبہ محرک' یہ ہے' آیت 53 جہاں سے آپ کا درس شروع ہوتا ہے۔ اور یہ ایسا مسئلہ تھا کہ وہ دور جانے کی ضرورت ہی نہیں اس میں رہی' اسی میں آیت 71 نکال لیجئے۔ جو کمانے کے قابل نہیں ان کی ضروریات کون پوری کرے؟ آیت 70 میں تو بات یہاں سے یوں چلی آ رہی ہے کہ **وللہ خلقکم ثم یتوفکم ومنکم من یرد الیٰ ارذل العمر لکی لایعلم بعد علم شیئًا۔ ان اللہ علیم قدیر** (16/70) کہا کہ ذرا اپنے گھر کے نقشے کے اوپر ایک نگاہ دوڑائیے۔ آج ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تمہارے ہاں۔ ظاہر ہے کہ وہ خود کمانے کے قابل نہیں ہے۔ تو کیا تمہارا اصول یہ ہے کہ جو کمائے گا اسی کو اتنا ہی ملے گا۔ جو نہیں کمائے گا اس کو کچھ نہیں ملے گا۔ تو یہ بچہ تو پہلے دن ہی مار دینا چاہئے۔ وہ تو کما ہی نہیں سکتا کچھ۔ کہا کیا کرتے ہو تم۔ کرتے ہو' عند الضرورت گھر والے بھوکا رہتے ہیں اس کے لئے دودھ کا انتظام کرتے ہیں۔ اپنی ساری ضروریات پس پشت ڈال لیتے ہو' جو کچھ نہیں کما رہا اس کی ضرورت سب سے پہلے پوری کرتے ہو۔ کہا کہ کہو نا' وہ اصول لاؤ' نا کہ صاحب ٹھیک ہے جو محنت کرے گا اس کو اتنا ہی ملے گا۔ یہ پرورش کی ذمے داری تم نے اپنے اوپر لے رکھی ہے نا اس بچے کی' تو ساری توجہات کا مرکوز یہ نکتہ ہو جاتا ہے ناں کہ اس کی پرورش ہم نے کرنی ہے۔ یہ سوال تو نہیں پیدا ہوتا کہ یہ کماتا کیا ہے۔ اور کماتا ہی کچھ نہیں۔ اور جب درمیان کی عمر آتی جاتی ہے تو اس میں ٹھیک ہے تم بہت کماتے ہو' بہت زیادہ کماتے ہو۔ ہوتا ہے یہ کچھ بھی۔ اور پھر بڑھاپے کی عمر آ جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر کمانے کی صلاحیتیں' استعداد کم ہو جاتی ہیں تو پھر کیا ہوتا ہے' ایک بوڑھے باپ کے متعلق' اس کی ضروریات پوری کرتے ہو یا پھر وہ یورپ والوں کی طرح سے اس کو دھکا دے دیتے ہو کہ جاؤ جا کر وہاں poor house میں اپنے دن بسر کرو۔ **وبالوالدین احسانا۔** کیا کہا تھا کہ جتنی کمی آ گئی ہے ان کی' اس کمی کو پورا کرو۔ یہ کمانے والے افراد کے اوپر دونوں ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں یا نہیں کہ وہ جو کما کے لائے' پہلے اس بچے کی پرورش کی ذمہ داری پوری کرے جو کچھ نہیں کما رہا۔ پھر ان بوڑھوں کی ذمہ داری پوری کرے جواب کم کمانے کے قابل رہ گئے ہیں۔ اور یہ زیادہ سے زیادہ محنت کرے۔ جتنی یہ ذمہ داریاں بڑھتی ہیں اتنا ہی زیادہ کام کرتے ہو یا نہیں؟ اچھا باپ اسی کو کہیں گے ناں کہ جو ذمہ داریوں کی نسبت سے زیادہ محنت کرے۔ روز یہ ہوتا ہے کہ صاحب نوکری تو میں کرتا ہوں اس سے گھر کا پورا نہیں پڑتا' ذمہ داریاں میری بڑھ گئی ہیں۔ اس لئے میں اب شام کو بھی جا کے کام کرتا ہوں۔ میں نے پارٹ ٹائم بھی ایک جاب لے لیا ہوا ہے۔ کرتے ہو ناں یہ زیادہ سے زیادہ محنت۔ کیا جذبہ محرکہ ہے آپ کا جی اس میں۔ یہی چیز کہ میری ذمہ داریاں جو ہیں ان کو پورا کرنے کے لئے مجھے زیادہ سے زیادہ کام کرنا پڑے اور اس میں پھر وہ یہ بھی تو ہے ناں' کم از کم خود لیتے ہو زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیتے ہو۔ جس

باپ کی یہ کیفیت ہو کہ گھر میں بچے تو بھوکے مر رہے ہوں اور وہ بازار میں بالائی کھا رہا ہو' ساری دنیا اس کو بھڑوا کہتی ہے۔ ربوبیت کا تقاضہ یہ تو نہیں ہے۔ ہے ناں تم اپنے ہاں یہ کرتے۔

معاشرہ کا صحیح مفہوم

یعنی آپ دیکھئے کہ کہاں سے بات وہ شروع کی ہے اس نے کہ یہ نقشہ ہے تمہارے ہاں کا' وہ کہتا یہ ہے کہ یہ نقشہ جو ایک گھر کی چار دیواری کے اندر ہے' ان دیواروں کو ذرا ادھر اور ادھر سے نیچے گرا دیجئے' ذرا سا کشادہ کر دیجئے۔ جسے اس نے ''بر'' کہا ہے' جس کا ترجمہ ہم نے نیکی کیا ہے **لیس البر ان تولو وجوھکم قبل المشرق والمغرب** 2/177 ''بر'' یہی نہیں ہے۔ بر کا معنی کشادگی ہے۔ وہ کہتا ہے ذرا نگاہوں کو کشادہ کرو اور یہی جب دیواریں تم گرا دو گے' اسکا نام معاشرہ ہو جائے گا۔ کہا یہاں تک تو تم اس اصول پر عمل پیرا رہتے ہو۔ یہ معاشرے کے اندر اس اصول کو کیوں نہیں اپناتے اور اگلی آیت ہے' عزیزان من قرآن ہے! **واللہ فضل بعضکم علیٰ بعضٍ فی الرزق** 16/71 اکتسابِ رزق کی صلاحیتوں میں فرق ہے۔ کسی کو زیادہ حاصل ہیں کسی کو کم حاصل ہیں۔ بچے میں تو ہوتی ہی نہیں ہے ابھی۔ دیکھا پہلی آیت کے ساتھ کیا ربط آ رہا ہے **واللہ فضل بعضکم علیٰ بعضٍ فی الرزق** 16/71) بس یہ ہے ایمان۔ یہ جو صلاحیتیں ہیں جن کا تم فرق دیکھ رہے ہو' یہ خدا کی عطا کردہ ہیں۔ اور آگے پھر وہ بات کہی ہے۔ کہنے کا انداز کیا ہے۔ کہنے لگے یہ سب کچھ تم نے سمجھ لیا' اپنے ہاں کرتے بھی ہو تم گھر کے اندر' یہ بھی تمہیں ماننا پڑے گا کہ یہ جو صلاحیتیں ہیں یہ اکتسابِ رزق کی' بنیادی طور پر یہ تمہاری نہیں خدا کی دی ہوئی ہیں۔ اور آ گیا **فما الذین فضلوا برآدی رزقھم علیٰ ما ملکت ایمانھم فھم فیه سوآء** 16/71۔ کہتا ہے کہ پھر یہ کیوں نہیں تم ایسا' یہ کیوں نہیں کرتے کہ جن کو زیادہ صلاحیت حاصل ہے اکتسابِ رزق کی' پیدا کرنے کی' وہ زائد از ضرورت ہے' یہ جسے ہم فاضلہ کہتے ہیں' بنیادی مادہ تو اس کا بھی یہ ف ض ل ہی ہے ناں' جہاں سے یہ فضلہ ہے۔ گو کہ اس میں سے فاضلہ تمہارے پاس آ گیا' زائد از ضرورت آ گیا ہے' تم اسے اپنے ماتحت کام کرنے والوں کی طرف لوٹا نہیں دیتے۔ یہاں ایک لفظ ہے عزیزان من! ''**برآدی**'' قرآن ہے! یہ جو چیز ہے جو تم کو زائد از ضرورت ہے اس بنا پر کہ تمہیں خدا نے زائد صلاحیت دی ہے کمانے کی اس کی وجہ سے' تو زائد از ضرورت تمہارے پاس آیا ہے' اب ہمارے ہاں تصور یہ ہوگا کہ یہ دوسرے کو دینا خیرات ہے' بخشش ہے۔ عربی زبان میں بھی کہتے تو عطیہ ہی کہہ دیتے اور کچھ نہیں۔ وہ کہتا ہے **برآدی** کا معنی ہوتا ہے جس کی کوئی چیز ہو اس کو واپس دے دینا۔ لوٹا دینا۔ یہ تمہاری ایک امانت میرے پاس رکھی ہوئی تھی' یہ لے لو میاں اپنی۔ **برآدی' اللہ اکبر' لاریب** یہ خدا کا کلام ہے۔ جو تمہارے ماتحت کام کرتے ہیں۔ یہی ہے نا انجینئر میں اور لیبر میں فرق۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جو ہے تمہاری زائد capacity کہ تم اتنا زیادہ حاصل کرتے ہو۔ تو تم ان کو لوٹا کیوں نہیں دیتے۔ یہ تمہارا نہیں ہے' یہ تو سب ان کا ہے۔ یہ سب مشترکہ تھا تمہارا۔ کیوں نہیں لوٹاتے' لیکن اسکے برعکس تمہارا جذبہ دل ہی دل میں یہ کہتا ہے **فھم فیه سوآء** کہ اس طرح سے تو ہم اور یہ سب برابر ہو گئے۔ اچھا یہ ہے جذبہ تمہارے اندر۔ کہ یہ تو میرا تھا اور جتنا یہ کماتے ہیں ان کے لئے صرف اتنا ہی ہے اس لئے یہ میں اگر ان کو

دے دوں تو ہم تو برابر ہو گئے۔ سنیے عزیزان من! پہلے وہ آیت کے چار لفظ ہم نے دیکھ لئے ناں کہ جو کچھ بھی نعمت ہے، وہ خدا کی عطا کردہ ہے، کہتا ہے یہ تصور کہ یہ زائد جو ہے، ہم ان کو دے دیں جو کم کمار ہے ہیں، جنہیں کم استعداد یا صلاحیت حاصل ہے۔ کہتا ہے یہ اس لئے کہ **افبنعمة الله يجحدون** کیا تم اس بات سے پھر انکار کرتے ہو اور اس بات پر اصرار کرتے ہو کہ جو نعمت حاصل ہے تمہیں یہ تمہاری ہے خدا کی طرف سے نہیں ہے۔ کہا کہ پھر ٹکراؤ تمہارا اس بات پہ ہے ناں یہ جو تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس طرح زائد دینے سے تو ہم یکساں ہو جائیں گے، مساوی ہو جائیں گے، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو چیز خدا کی طرف سے تمہیں ملی ہوئی ہے، اسے بھی تم اپنی ملکیت تصور کرتے ہو۔ کیا یہ چیز جو ہے، ان نعمتوں کا خدا کی طرف سے ہونے سے انکار کرتے ہو بلکہ انکار کی بجائے بھی یہاں **يجحدون** کا لفظ ہے۔ یہ ہے کیفیت تمہاری، اسی لئے یہ تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ناں کہ ہم زائد از ضرورت کیوں دے دیں۔ کہا کہ اس کے معنے تو یہ ہیں کہ تمہارا یہ جو تھا پہلا بنیادی ایمان **فمن الله**۔ جو خدا کی طرف سے ہے، اس سے انکار کر رہے ہو تم۔ یہاں تو یہ بات اس سے مثبت کہی۔

وسائلِ رزق کا مالک اللہ ہے

قرآن کریم نے اسی لئے مال کے متعلق جہاں وسائلِ رزق کے متعلق اس نے یہ چیز کہی ہے کہ وہ خدا کے ہی دیئے ہوئے ہیں تمہاری اپنی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ یہ مال و دولت کے متعلق بھی اس نے یہی چیز کہی ہے، اس لئے کہ یہ جو چیزیں ہیں، وسائلِ رزق اور اس میں سے رزق پیدا کرنے کی صلاحیت جو دی ہوئی ہے، جس کو نعمت کہہ کے اس نے پکارا ہے، وہ تو **فمن الله** جب ہو جائے گا تو اس میں سے جو پیداوار ہو گی، اسے بھی تو **فمن الله** ہی کہیں گے۔ وہ کہتا یہ ہے **اهم يقسمون رحمت ربک** یہ تو دوسری بات ہو گئی **نحن قسمنا بينهم معيشتهم فى الحيوٰة الدنيا ورفعنا بعضهم فوق بعض درجٰت ليتخذ بعضهم بعضاً سخرياً و رحمت ربک خير مما يجمعون** (43/32) وہ کہتا ہے یہ جو فرق ہے صلاحیتوں کا یہ صرف اس لئے ہے کہ معاشرے میں تقسیمِ عمل، تقسیمِ کار کا تقاضہ یہ ہے کہ مختلف قسم کے کام مختلف لوگ کریں۔ مختلف صلاحیتوں والے مختلف قسم کے کام کریں۔ یہ تو تقسیم کار کے لئے ہے ایسا۔ اور تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم مالک بن بیٹھتے ہو یہ تصور کر کے زعم باطل میں کہ یہ سب ہماری ملکیت ہے، یہ ہمیں یہ صلاحیت زیادہ مل گئی ہے، یہ بھی ہماری ملکیت ہے۔ اس کا محاصل بھی ہمارا ہونا چاہئے۔ وہ کہنے لگے صرف اتنی سی چیز ہے **رحمت ربک خير مما يجمعون** (43/32) تم جو اس سوال کی بنیاد پر کہ ہمیں جو صلاحیت زیادہ حاصل ہے، اس کے محاصل کے ہم مالک ہیں، زائد از ضرورت سے جو اپنے لئے جمع کر کے الگ رکھ لیتے ہو، یاد رکھو! **رحمت ربک خير** خدا کی رحمت ہے جو اس کی طرف سے اس طرح سے سامانِ رزق ملتا ہے، یہ اس سے کہیں بہتر ہے جو تم اپنے لئے یوں جمع کر کے رکھتے ہو۔ کم بختو! اس کو تو آگ لگے گی، جل جائے گا۔ سیلاب آ جائے گا بہہ جائے گا۔ کوئی لوٹ کے لے جائے گا اور اگر یہ ذمہ داری نظام کے اوپر ہو گی تو تمہاری سب کی ضروریات زندگی وہ پورا کرے گا، نہ سیلاب بہا کے لے جائے گا نہ آگ جلا جائے گی اور نہ لوٹ کے کوئی لے جائے گا۔ یہ ہے رحمتِ رب۔ کیوں زائد از ضرورت جمع کر کے رکھتے ہو۔ اب اس میں اس کے برعکس جو نظریہ ہے وہ جس پر نظام سرمایہ داری کی ساری بنیاد ہے، وہ نظریہ

وہ سامنے لاتا ہے۔ آپ کے ہاں' ہر فرد یہ کہتا ہے' وہ جسے کہتے ہیں کہ ملکیت کا جذبہ جو ہے' انسان کے اندر ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کو میری کہتا ہے۔ اور اس کی بنیاد یہ ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جو کچھ مجھے زیادہ حاصل ہو رہا ہے یہ میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ یہ ہے ناں بنیاد' جسے آپ سرمایہ داری یا Capitalism کا نظام کہتے ہیں۔ اس کی بنیاد اس سے ہوتی ہے کہ وہ ہر فرد یہ کہتا ہے کہ جو کچھ میں کماتا ہوں یہ میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے یہ میری ملکیت ہے۔ کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ اس میں کسی طرح سے interfere کرے۔ نظام سرمایہ داری میں no right of interference وہ ہے بنیاد کہ کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ اس میں مداخلت کرے۔ کیونکہ یہ میری محنت کا نتیجہ ہے جو کچھ میں نے کمایا ہے' جو کچھ مجھے حاصل ہے۔ یہ بالکل متضاد ہو گئی اس اعلان سے جو قرآن نے کہا ہے **فمن اللہ**۔ اس میں مثال یہ دے کر بیان کرے گا نظام سرمایہ داری کا نظام یا اس کے نزدیک قانون ہے۔

قارون اور قومِ موسیٰؑ

یہ تو ضرب المثل ہے آج تک۔ 28/76 **ان قارون کان من قوم موسیٰ** کیا بات ہے قرآن کی عزیز ان من۔ یعنی قوم موسیٰ کہہ کر کتنی عظیم چیز کہہ گیا بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ بتایا یہ تھا کہ قوم موسیٰ میں سے تھا۔ تو پہلے کہتا چلا آ رہا ہے کہ بنی اسرائیل کے اوپر ایک تو یہ عذاب تھا جو ایک غیر قوم نے' فرعون نے ان کے اوپر عائد کر رکھا تھا۔ ان کو اپنی محکومیت کے پنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ اس کے بعد کا شکنجہ فولادی ان کے سینے پہ تھا وہ تو دوسری قوم تھی۔ کہا یہ قیامتیں اس قسم کی جو ہیں' سوال اس میں یہ نہیں ہوتا کہ اپنی قوم کے ہیں یا دوسری قوم کے۔ خود اپنی قوم کے اندر کے سرمایہ دار تو اس سے بھی زیادہ خون آشام ہوتے ہیں' **من قومِ موسیٰ**' یہ تو اپنی قوم کا فرد تھا۔ تو کہا کہ اتنا کچھ اس کو حاصل تھا کہ اس کے بڑے خزانے تھے۔ ان خزانوں کے تم اتنے بڑے' اس زمانے میں تو دھات ہی ہوتی تھی ناں۔ یہ دولت جو تھی' نوٹ تو نہیں ہوتے تھے۔ چیک تو نہیں ہوتا تھا۔ تو سات لاکھ کا دو تو اتنا سا پرزہ۔ یہ تو اگر لاکھ روپیہ اٹھانا پڑے تو اس کے لئے کئی قلی درکار ہوتے ہیں۔ اس نے یہ کہا کہ وہ اتنی دولت تھی کہ اس کو اٹھانے کے لئے بھی اتنے لوگ چاہئیں تھے اور اس کی بنیاد کے اوپر **لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین** 28/76. وہ بہت بڑا بن رہا تھا۔ پھولا نہیں سماتا تھا۔ اس کی بنیاد سے اسے کہا جاتا تھا یہ ایمان رکھنے والے تھے کہ یہ نہ کر اور کتنی عجیب چیز کہی قرآن نے **وابتغ فیما اٰتٰک اللہ الدار الاٰخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا** 28/77۔ خدا کی وحی کی رو سے بات کہنے والے اس سے کہتے تھے کہ ہم تم کو یہ نہیں کہتے ہیں کہ یہ دنیاوی زندگی میں گدڑی پہن لو اور جو کی روٹی کھا لے اور یہ سارا چھوڑ دے۔ اور تیاگ لے۔ یہ جوگ اور سنیاس۔ بالکل نہیں۔ دنیا کی زندگی میں بھی اپنے حصے کو فراموش نہ کر۔ خوب کھاؤ پیو سب کچھ لیکن جب **وابتغ فیما اٰتٰک اللہ** جو کچھ خدا نے تجھے دیا ہے اس میں آخرت کی فکر بھی اپنے ساتھ رکھ۔ وہی ذات کی نشوونما جسے کہا گیا ہے۔ اس کا طریقہ جو **واحسن کما احسن اللہ الیک** 28/77۔ یہ احسن اللہ ہے۔ یہ خدا نے یہ جو دوسروں کے ہاں کمیاں ہیں اور تمہیں یہ زیادہ دے کے اس کو اس طرح سے زیادہ ہوا ہے' جو کمی پوری کی ہوئی ہے' یہ خدا کی عطا کردہ ہے۔ اس طرح اس نے تمہارے ساتھ یہ کیا ہے تو باقیوں کے مقابلے میں تمہیں یہ زائد دیا ہے۔ جس کے پاس کھانے کے لئے رزق کم ہے

اسے تم اسی اعتبار سے دیئے چلے جاؤ۔ خدا تمہارے ساتھ یہ کرتا ہے، تم ان کے ساتھ یہ کچھ کرو۔ **ولا تبغ الفساد فی الارض** 28/77 اور ملک کے اندر فساد برپا نہ کر۔ اب دیکھیے لفظ فساد یہاں آیا ہے۔ یہ جتنے بھی Capitalist ہوتے ہیں ان کو کبھی بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ لٹھ لے کے باہر آ گئے ہوں یا دم مار رہے ہوں یا فتنہ کھڑا کر رہے ہوں۔ کبھی یہ کرتے ہی نہیں ہیں۔ یہ تو ایسے وقت میں اور زیادہ بلوں کے اندر گھس جاتے ہیں۔ تو فساد یہ تو ہے نہیں۔ کہ فساد نہ پیدا کر۔ یہ جو ہے رزق کی غلط تقسیم جس سے طبقات پیدا ہوتے ہیں یہی تو فساد ہے حقیقت میں۔ اس کے معنے ناہمواریاں ہوتے ہیں۔ فساد نہ پیدا کر۔ **ان اللہ لا یحب المفسدین** 28/77۔ خدا کے نظام میں یہ فساد پیدا کرنے والے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ یہ تھا جو یہ لوگ اس سے کہتے تھے۔ اب قرآن نے وہ ذہنیت بیان کی ہے یا نظریہ بیان کیا ہے جس پہ یہ ساری نظامِ سرمایہ داری کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ وہ بھی چار ہی لفظ ہیں۔ اس نے جواب دیا **قال انما اوتیتہ علیٰ علمٍ عندی** 28/78۔ اس نے کہا کہ یہ سب جو کچھ مجھے ملا ہے، میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے یہ میرا ہے اور میں اس کا مالک ہوں جس طرح جی چاہے اس کو صرف کروں، جمع رکھوں کسی کو دوں، نہ دوں تم کون ہوتے ہو یہ کہنے والے۔ یہ ہے عزیزانِ من وہ نظریہ۔ **انما اوتیتہ علیٰ علمٍ عندی** 28/78 اور اس کا جواب اتنا ہی نقل کیا ہے۔ بات اس کے بعد اس کے نتیجے کی کہی ہے **اولم یعلم ان اللہ قد اھلک من قبلہ من القرون من ھو اشد منہ قوۃً و اکثر جمعًا ولا یسئل عن ذنوبھم المجرمون** 28/78 کہا اسے یہ پتا نہیں ہے کہ اس سے پیشتر اس نظام کی حامل قومیں کہ جو اس سے کہیں زیادہ جمع کر کے رکھا کرتی تھیں۔ Capitalist وہی جمعاً قرآن کہتا **اشد منہ قوۃً و اکثر جمعًا** قوت بھی بڑی تھی اور ان لوگوں نے جو جمع کر رکھا تھا پوچھو ہی نہیں کتنا تھا۔ اسے پتہ نہیں ہے کہ اسی فساد کی وجہ سے کس طرح سے تباہ ہو کے رہ گئیں یہ قومیں۔ یہ اس کے مقابلے میں ہے کوئی شے؟ یہ وہ ذہنیت تھی جو قرآن میں ایک طرف نظام سرمایہ داری کے متعلق بیان کی گئی۔ اسے ادھر سے تو اسے ختم کر دیا **وما بکم من نعمۃ فمن اللہ** دوسری طرف یہ جو نظام قائم کرنا تھا کہ ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ وہ کام کرے اور یہ جو چیز ہے ناں to each according to his need یہ نہیں ہے کہ اس میں سے اسے دیا جائے قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ یہ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ سوال ہمارا ہے۔ یہ ذمہ داری ہماری ہے۔ یہ نظام خداوندی کی ذمہ داری ہوگی کہ یہ اس کی اور اس کے بچوں کی ضروریات زندگی پورا کرتا رہے۔ **وما من دآبۃٍ فی الارض الا علی اللہ رزقھا** 11/6۔ یعنی آپ نے دیکھا ہے کہ قرآن ان دو چار آیتوں کے اندر کس طرح سے بات واضح کر گیا۔ کہ نظام سرمایہ داری کی تو جڑ کاٹ کے رکھ دی اس نے۔ یہ ذہنیت جس میں وہ کہنے والا ہے کہ جو کچھ مجھے ملا ہے میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ اور ادھر سے یہ چیز کہ ان کو یہ جذبہ محرکہ نہیں ملتا کہ کیوں ایک شخص جان مار کر کام کرے جب اسے پتہ ہے کہ اس میں سے مجھے کم از کم ملنا ہے زیادہ جو فاضلہ ہے وہ دوسروں کے پاس چلے جانا ہے۔ وہ کیوں ایسا کرے اس کیوں کا جواب یہ دیا ہے قرآن نے عزیزانِ من۔ یہ ہے جسے وہ کہتے ہیں کہ صاحب، یہ تو پھر آپ faith کے اوپر بات کر رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے ابھی آپ سے کہ یہ ساری باتیں ہی faith پہ ہیں۔ قارون نے یہ کہا ہے یا قارون جس طبقے یا

نظام کی نمائندگی کر رہا ہے' ان کا ایمان ہے ناں کہ ہمیں جو کچھ ملا ہے **علیٰ علمٍ عندی** ہے۔ ہماری ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ آج بھی آپ جب ان کے ہاں کی جو Capitalism کے مدافعت میں یا اس کے حق میں جو بھی وہاں سے خیالات اور کتابیں ملتی ہیں' آپ ان میں پڑھیے' بنیاد اس پر ہوتی ہے۔ No right of interference جو ان کے ہاں کا مقولہ ہے اس کی بنیاد اس پہ ہے۔ تو یہ ہر شخص کو اس کی اپنی ہنرمندی کی رو سے ملتا ہے کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ چھین لے یا لے لے۔ یہ ان کا ایمان ہے۔ دوسری طرف ان کا یہ ایمان ہے کہ انسان کی زندگی یہ طبعی زندگی ہے اس کے بعد نہ خدا نہ اس کے قوانین نہ اس کی طرف سے کوئی وحی' نہ یہ چیز کہ یہ خدا کی عطا کردہ ہے۔ یہ ان کا ایمان ہے کہ خدا کی عطا کردہ نہیں ہے۔ خدا کی عطا کردہ نہیں ہے تو پھر یہ ان کی اپنی ہوئی۔ جب ان کی اپنی ہے تو تم کون ہوتے ہو interfere کرنے والے۔ وہ کہتے ہیں جی' سٹیٹ کو یہ حق حاصل ہے۔

سٹیٹ کے تصور کا تجزیہ

سٹیٹ کا تو میں نے تجزیہ analysis کر کے رکھ دیا تھا پچھلی کنونشن میں میرا خطاب' اسے ضرور پڑھئے گا وہ بڑا ہی اہم خطاب ہے' فرد اور مملکت میں نے اس میں بتایا یہ ہے کہ خدا کا انکار کرنے کے بعد' ان کو ضرورت تھی کہ کوئی ایسا خدا یا معبود بنایا جائے جس کے نام پہ کوئی قوانین نافذ کئے جائیں۔ لوگ ورنہ مانیں گے نہیں۔ انہوں نے واہمہ سے ایک تصور دیا ہے سٹیٹ کا۔ وہ سٹیٹ کہیں exists نہیں کرتی۔ یہی اربابِ اقتدار ہی کا نام ہوتا ہے۔ یہ دوسری طرف جو انہوں نے یہ کہا کہ ہمیں حق حاصل ہے کہ جو کچھ بھی ایک شخص اپنی محنت سے کماتا ہے' اس میں وہ جو جتنا کچھ ہے' وہ سٹیٹ کی ملکیت میں جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ نہ تو یہ زمین سٹیٹ نے پیدا کی تھی جو اس کی ملکیت میں چلی جائے۔ نہ ہی ان افراد کو یہ صلاحیت سٹیٹ نے دی ہوئی ہے جو ان کے اوپر بھی اس کو حق حاصل ہو۔ یہ ایک واہمہ ہے جو تم کہتے ہو۔ خدا کیوں نہیں کہتے اس کو۔ آپ کہیں گے فرق کیا ہے؟ بڑا فرق ہے عزیزان من سٹیٹ کہنے میں۔ آخر میں جب آپ جائیں گے تو چند اربابِ اقتدار آپ کے ہاں آئیں گے ناں جو بیٹھے ہوئے قانون بناتے ہیں۔ جب خدا کہیں گے تو وہ بھی بیچ میں سے نکل جائیں گے عزیزان من۔ ایمان تو تینوں جگہ ہی عزیزان من آیا۔ نظام سرمایہ داری میں بھی بنیاد ایمان پہ ہوئی اور وہ بنیاد ہوئی کہ **انما اوتیته علیٰ علمٍ عندی** یہ اس کا ایمان ہے۔ نظام سرمایہ داری کا ایمان۔ ان کا بھی یہ ایمان ہے کہ وحی' مستقل اقدار' خدا اور اس کے قوانین کوئی شے نہیں ہے' انسان ہی ہے۔ یہ بھی ایمان ہے اور اس ایمان کا نتیجہ فساد ہے جبکہ اس ایمان کا یہ نتیجہ ہے کہ تصور بڑا صحیح ہے جس پہ آپ پہنچے ہیں' اس کو عمل میں لانے کے لئے کوئی جذبہ محرکہ نہیں مل رہا۔ تو وہ نظریہ کیا ہے جی' جو عمل میں نہ آ سکے۔ آ ہی نہیں سکتا۔ آ سکے گا ہی نہیں۔ بیٹھ گئے' مطمئن ہو گئے سوشل ازم کے اوپر۔ سوشل ازم جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ نظام سرمایہ داری ہی کا دوسرا نام ہے۔ نظام سرمایہ داری میں آج بھی آپ کے ہاں جو چیز آئی ہے یہ مثلاً کارخانے' یہ زمینیں' یہ افراد کی ملکیت تھیں ناں۔ جس کو ہم نے نیشنلائز کیا ہے ان افراد سے چھین کے کسی اور کی تحویل میں دی ہیں جس کو ہم سٹیٹ کہتے ہیں۔ آخر میں آپ دیکھیں گے تو وہ انسانوں کا ہی کچھ مجموعہ ہو گا ناں۔ اس لئے کہ انسانوں سے بڑھ کر تو یہ کوئی اور مانتے ہی نہیں کسی کو۔ تو یہ تو انسانوں میں رہے گا اور عزیزان من! فساد' فساد ہی ہے خواہ اس کا برپا کرنے والا

ایک انسان ہو یا انسانوں کا ایک گروپ ہو۔ یہاں چوراہے پہ آپ کو ایک فرد آ کے پستول دکھا کر لوٹ کے لے جائے وہ بھی ہائی وے کے اوپر ڈاکوؤں کا ایک گروہ آ جائے تو وہ بھی۔ ان کا یہ فعل جائز اس لئے ہو جائے گا کہ ہم بہت سے ہیں۔ قرآن نے قوم الحجر مین کہا ہے۔ ڈاکوؤں کا گروہ۔ یہ ایمان ہے عزیزان من۔ جس کی بنیاد کے اوپر نہ فرد کو یہ حق رہتا ہے نہ افراد کو گروہ کو یہ حق رہتا ہے وہ اُن کے اوپر بھی وہ خدا ہوتا ہے اِن کے اوپر بھی وہ خدا ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اُن کا بھی یہ ایمان ہوتا ہے اِن کا بھی ہوتا ہے۔ اور اس میں تو اُن اور اِن میں فرق ہی کوئی نہیں ہوتا۔

باہمی مشاورت کا نظام

امرھم شوریٰ بینھم 42/48 ہوتا ہے۔ اس چیز پر ایمان رکھنے والے باہمی مشاورت سے یہ انتظام کرتے ہیں کہ کیسے کیا جائے۔ ان میں سے کوئی ایک گروہ بھی ایسا نہیں ہوتا جس کو دوسروں کے اوپر کسی قسم کے استحصال یا exploitation کا حق حاصل ہو۔ خواہ نام کچھ بھی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ یہ نظام ہے جس کو آپ نظام خداوندی یا مملکت اسلامیہ یا خلاف علیٰ منہاجِ رسالت کہیں گے۔ وہ نظام جو نبی اکرم ﷺ اور حضورؐ کے ساتھیوں نے متشکل کیا تھا۔ اس ایمان کے اوپر **وما بکم من نعمة فمن الله**۔ آپ نے غور فرمایا عزیزان من! کہ کسی نظام کے لئے ایمان کی کتنی ضرورت ہے۔ بنیاد ہی ایمان بنتا ہے۔ جو لادین کہتے ہیں اپنے آپ کو اُن کا بھی ایمان ہوتا ہے۔ لادینیت پہ ایمان ہوتا ہے۔ کمیونسٹ کا بھی ایمان ہوتا ہے۔ Capitalist کا بھی ایمان ہوتا ہے۔ قرآن کے ماننے والے عبدِ مؤمن کا بھی ایمان ہوتا ہے۔ ایمان ہوتا کس چیز کے اوپر ہے اس میں ہے سارا فرق۔ اس لئے جب وہ یہ کہے کہ صاحب جب تم ایمان میں faith کی بات کرو گے تو اس پہ ہم نہیں آئیں گے اس لئے کہ ہم نہیں مانتے اس کو۔ ان سے کہو کہ غلط کہتے ہو۔ تم بھی اپنی بات faith پہ کر رہے ہو۔ یہ کہنا کہ وحی کوئی نہیں ہے تمہارا faith ہے۔ یہ کہنا کہ وحی ہے ہمارا faith ہے۔ یہ کہنا کہ یہ میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے نظام سرمایہ داری کی بنیاد یہ اس کا faith ہے۔ تمہارا یہ کہنا ہے کہ فرد کا نہیں ہے یہ سٹیٹ کی ملکیت ہو جاتی ہے تمہارا faith ہے۔ ہمارا faith یہ ہے کہ اس میں انسانوں میں کسی انسان کی یہ ملکیت ہوتا ہی نہیں ہے۔ اس لئے کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس طرح سے interfere کرے۔ یہ حق ان سے بالاتر ایک ہستی ہے اور وہ اس لئے اس کے اوپر ہمارا ایمان ہے کہ یہ عطا کردہ واقعی اس کا ہے۔ تو سٹیٹ عطا نہیں کر سکتی کسی فرد کو اس کی صلاحیتیں یا زمین نہیں بنا سکتی۔ ان سے کہو ناں population بہت بڑھ رہی ہے صاحب اس زمین کی اب capacity کم ہو گئی ہے ان سے کہیے کہ بہت اچھا صاحب اسی قسم کا کرہ ارض ایک اور بنا لیجئے ساتھ۔ اسے تم کہہ سکو گے کہ سٹیٹ کی ملکیت ہے۔ یا فرد کی ملکیت ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی زمین کے اوپر تم نہیں یہ کہہ سکتے۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔ قرآن کے ماننے والے کا ایمان ہے۔ اور جب یہ ایمان ہے کہ جو کچھ میری صلاحیتیں ہیں وہ بھی میری اپنی نہیں ہیں۔ یہ بھی اس کی عطا کردہ ہیں۔ جن چیزوں پہ میں نے ان صلاحیتوں کو استعمال کر کے اس میں سے رزق پیدا کرنا ہے وہ بھی میری اپنی نہیں ہیں۔ وہ بھی خدا کی عطا کردہ ہیں۔

قرآن کا دیا ہوا معاشی نظام

وما بکم من نعمت فمن اللہ قرآن کہتا ہے یہ غلط نظام اس دعوے کو اس نظریے کو جھٹلانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ جو وہاں کہا ہے کہ کیا یہ لوگ خدا کی نعمت کو جھٹلاتے' انکار کرتے یا اس سے یہ ضد پہ اڑ جاتے ہیں کہ یہ ہمارا ہے' یہ اُس کا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے یہ ہے بنیادی نکتہ کہ جسے عزیزان من! آپ کہیں گے قرآن کا معاشی نظام۔ اسلامی مملکت کا نظام۔ اس کی بنیاد اس ایمان پہ ہوگی کہ یہ ساری چیزیں جتنی بھی ہیں فرد کی صلاحیتیں ہوں یا وسائلِ پیداوار ہوں' یہ نہ فرد کی ملکیت' نہ افراد کی ملکیت' نہ انسانوں کی ملکیت۔ **فمن اللہ** خدا کی ملکیت۔ اور جب جس کی ملکیت مان لی جائے پھر اس کو تو حق ہوتا ہے ناں کہ اپنی ملکیت میں تصرف کرے اور اس کو استعمال کے لئے قاعدے اور قانون بھی مقرر کرے۔ ہمارا ایمان ہے کہ یہ اس کی ملکیت ہے اور اس نے قاعدے اور قانون مقرر کئے اس ارض کے استعمال کے لئے بھی۔ مجھے بھی کہا کہ تم اپنی ان صلاحیتوں کو اس طرح استعمال کرو۔ مجھ پر بھی یہ قانون لاگو ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ میری نہیں ہیں۔ اسے ہم وحی کا قانون کہتے ہیں۔ اس پر ہمارا ایمان ہے۔ تمہارا ایمان ہے ناں سٹیٹ کے قانون پر۔ ذرا اعلان کر دیجئے ناں کہ میں نہ سٹیٹ کو مانتا ہوں نہ اس کے قوانین کو مانتا ہوں۔

جہاں مارکس ناکام رہ گیا

ہمارا یہ ایمان ہے۔ اور وہ جو جہاں آ کے مارکس عاجز رہ گیا ہے' یہاں سے آگے ایک قدم لے جاتا ہے قرآن۔ یہ کہتا ہے میں دیتا ہوں جذبہ محرکہ۔ اور وہ ہے یہ ایمان کہ **وما بکم من نعمت فمن اللہ**۔ عزیزان من! غور کیجئے جو قرآن نے قدم قدم پہ کہا ہے کہ غور اور فکر کرو اس قرآن کے اندر۔ یہ آیت چار لفظوں کی ہے۔ کون ہے ہم میں سے جس نے یہ آیت نہیں پڑھی۔ کتنی بار یہ آیت نہیں دہرائی جا چکی۔ آپ نے دیکھا کہ ذرا کھڑے ہو کے اس پہ غور کیا تو کتنا ایک اہم مشکل ترین مسئلہ جو انسانیت کا ہے' وہ چار لفظوں کے اندر حل ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک ہی مثبت ایمان نے یہ غلط ایمانوں کی جڑیں کیسے کاٹ کے رکھ دی ہیں۔ دونوں طرف سے۔ نظام سرمایہ داری کی بھی جڑیں کاٹیں یہ جو نیا آپ کے ہاں کا اشتراکیت' سوشل ازم یا کمیونزم کا نظام چلا آ رہا ہے' اس کی بھی جڑیں کاٹ دیں۔ جڑیں کیا کاٹیں' کہا یہ کہ نہ وہ مسئلے کا حل دے سکتا ہے' نہ یہ مسئلے کا حل دے سکتا ہے۔ ان کے ہاں بنیادی طور پے نظریہ ہی باطل ہے۔ ان کے ہاں بھی یہ جو چیز' جس پہ نظریے کے اوپر یہ پہنچے ہیں کہ ایسا ہونا چاہئے۔ ان کے پاس اس پہ عمل کرنے کے لئے کوئی جذبہ ہی ہے نہیں۔ قرآن نے جو کہا ہے ناں کہ یہ مصدق ہے ان دعاوی کا جو یہ لوگ کرتے چلے آ رہے ہیں' تو میں نے کہا تھا کہ اس کے معنے تصدیق کرنے والا نہیں ہے کہ یہ ان کو سچا کہتا ہو۔ مصدق کے معنے ہوتے ہیں سچ کر کے دکھانے والا۔ قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک دعویٰ یا نظریہ دیتا ہے اور پھر اس کو سچ کر کے دکھا دینے کے طریقے بھی بتاتا ہے۔ پھر کہوں کہ جہاں مارکس عاجز ہو کے رہ گیا تھا' یہ وہاں آتا ہے وہاں آ کے بتاتا ہے۔ تو یہ ہے اس کا طریقہ اور اس کو جیسا میں نے عرض کیا ہے' بنیاد ساری ایمان پر ہے۔ اب آپ یہ سوچتے ہیں کہ اللہ پہ ایمان کے معنے کیا ہیں۔ کبھی ہم نے اس پہ غور کیا کہ ہماری عملی زندگی کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہے۔ کبھی اس پہ غور کیا ہے کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں اور وہ نہیں مانتا' فرق کیا

ہے۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں ناں کہ ہم مسلمان ہیں اور وہ کافر ہے۔ بس یہی فرق ہے۔ ارے یہ فرق کیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ اس سے تمہاری زندگی پہ فرق کیا پڑتا ہے۔ انفرادی زندگی پر۔ اجتماعی زندگی پر۔ نظام پر۔ نظام مملکت پر۔ لیکن ہم تو یہ آیتیں پڑھتے ہیں اور پڑھنے کے بعد آگے گزر جاتے ہیں۔ بس کیا ترجمہ کہ کوئی نعمت نہیں جو تمہیں حاصل ہو یہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ چلئے صاحب بات ختم ہوگئی۔ آگے کچھ نہیں۔ آپ نے دیکھا عزیزان من! کہ چار چار لفظوں کی آیتیں' آیتوں کے یہ حصے کس طرح سے ایک پورے نظام کی بنیاد بنتے ہیں قرآن کی رو سے۔ یہ ہے ایمان۔ فمن اللہ۔ یہ ہے اللہ پر ایمان۔ کہا ان کی بھی یہ کیفیت ہے ذرا پوچھو **اذا مسکم الضر فالیہ تجرُون۔ ثم اذا کشف الضر عنکم اذا فریق منکم بربھم یشرکون** 16/53-54۔ آہاہا! کیفیت یہ ہے کہ جب غریبی آتی ہے' ناداری آتی ہے' مصیبت آتی ہے پھر تو یا اللہ دے! اس وقت تو یہ ہوتا ہے۔ پھر اللہ یاد آتا ہے۔

غریب کا معنیٰ نادار نہیں نادِر ہے

آپ نے دیکھا ہے کہ غلط نظام میں بھی یہ جو مذہب کا نظام ہے' یہ کہتے ہیں کہ صاحب' یہ ایک حدیث کا جو غلط مفہوم انہوں نے پیدا کرلیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اسلام غریبوں میں پیدا ہوا اور آخر میں پھر غریبوں میں ہی عود کر کے آئے گا۔ کیا غلط مفہوم ہے۔ عربی زبان سے ناواقفیت ہے۔ عربی زبان میں غریب مفلس کو کہتے ہی نہیں ہیں۔ غریب کا تو معنی ہوتا ہے جو باقیوں سے انوکھا ہو۔ تو کہا یہ نظام انوکھا ہے باقی نظاموں سے۔ آج بھی یہ انوکھا ہے جب دوبارہ بھی تم اس پہ کام کرو گے' باقی نظاموں سے انوکھا نظام ہوگا۔ کسی کے ساتھ اس کی مشابہت اور مفاہمت نہیں ہوسکتی۔ کہ غریب' غرابت کے معنی ہیں انوکھا ہونا ہے۔ کیا مذہب کی دنیا کے اندر بھی تمہاری یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ یہ کچھ تو نہیں مانتے لیکن جب مصیبت بڑھتی ہے تو پھر دیکھتے ہیں' کیسے روتے ہیں۔ اور جب پھر اس کے بعد مل جاتا ہے' وہ رفع ہو جاتی ہے مصیبت' دولت آجاتی ہے' امارت آجاتی ہے' پھر اس بات کو بھول جاتے ہو کہ اس میں خدا کا بھی کچھ حصہ ہے۔

شرک اور کفر کا مفہوم

فریق منکم بربھم یشرکون۔ یہاں شرک کہا ہے عزیزانِ من! پھر ایک لفظ آ گیا ہے وقت بھاگا جا رہا ہے اور الفاظ میرا دامن پکڑ رہے ہیں۔ ٹھیک ہے ہم کیوں بھاگیں۔ زندگی نے مہلت دی ہے تو ہم تو آئیں گے۔ تم پھر اپنے رب کے ساتھ شرک کرتے ہو۔ بھئی وہ کیا شرک ہے جو یہ کرتے ہیں۔ کہتا ہے شرک یہ ہے **لیکفروا بما اتینٰھم** جو کچھ خدا نے یہ دیا تھا اس سے' انکار کرتے ہو کہ یہ خدا نے نہیں دیا ہوا۔ یہ میری ملکیت ہے۔ جو اس نے دیا تھا' کفر کے معنی چھپا کے رکھنا ہوتا ہے۔ انکار کرنا ہوتا ہے۔ **بما اتینٰھم** وہ تھا ناں **فمن اللہ**' یہ تھا ناں خدا پہ ایمان توحید' یہ تھا کہ مانا جائے خالصتاً خدا کا عطیہ ہے یہ۔ میری صلاحیت اور یہ وسائلِ رزق۔ اور اس کے بعد جب یہ ملا تمہیں مصیبت دور ہوئی تو پھر تم اس کے ساتھ شرک کرنے لگ گئے۔ ابھی یہ جرأت تمہاری نہیں ہوئی ہے کہ کھلے بندوں خدا سے انکار ہی کر دو۔ مسلمان بن کے رہنا تو ضروری ہے۔ شرک اس کے ساتھ یہ کیا کہ خدا کو مان بھی رہے ہیں اس کی نماز بھی پڑھ رہے ہیں اور شرک یہ ہے کہ یہ جو کچھ مجھے ملا ہے **علیٰ علمٍ عندی** یہ میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ **لیکفروا بما اتینٰھم** تاکہ تم اس کو دبا

کے، چھپا کے رکھ سکو۔ **اتینھم** یہ ہم نے دیا ہے ان کو۔ ہاں ٹھیک ہے اس نظام سے۔ ہم جانتے ہیں جو تم کہتے ہو کہ صاحب دولت حاصل ہے۔ یہ سب کچھ مجھے میسر ہے۔ **فتمتعوا** ٹھیک ہے، مفاد عاجلہ ہے اس کے کچھ فائدے ہیں۔ حاصل کر لیجئے۔ **فسوف تعلمون**۔ دیر نہیں لگے گی۔ بہت جلد اس نظام کے نتائج تمہارے سامنے آجائیں گے کہ اس کا کیا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ **فسوف تعلمون**۔ یہ ہے شرک عزیزان من۔ یہ چیز سمجھنا کہ یہ جو کچھ مجھے حاصل ہو رہا ہے **اتینھم** نہیں ہے، یہ اس کا دیا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ یہ میری ہنری مندی کے انعام میں مجھے ملا ہے۔ یہ شرک ہے عزیزان من۔ مذہب کی دنیا میں تو یہ شرک ہی ہوتا ہے کہ خدا کو مانتے بھی رہتے ہیں **ومن الناس من یقول امنا باللہ بالیوم الاخر وما ھم بمؤمنین** 2/8۔ دیکھو۔ یہ مذہب تو صبح شام الحمدللہ مسلمان ہیں، اللہ پہ ایمان ہے۔ آخرت پہ ایمان ہے۔ **وما ھم بمومنین** اب اگلا درجہ تو پھر ایک تو اعلانیہ کفر کا آجائے گا، اصطلاح میں جیسے ہم بولتے ہیں۔ Non Muslim جسے ہم کہتے ہیں۔ کہ جی وہ روس والوں نے یا چین والوں نے اور سوشلسٹ جو ہیں، انہوں نے تو انکار ہی کر دیا خدا کا۔ ٹھیک ہے جی۔ اور ایک بین بین ہے Beleivers in God unite together یہ یورپ کے سارے سرمایہ داروں کا نعرہ۔ آؤ خدا میں ایمان رکھنے والو آؤ اکٹھے ہو جاؤ۔ یعنی اندازہ لگاؤ، جو خدا پہ ایمان رکھنے والے یہ سرمایہ دار یہ ان کے مقابلے میں ہم کہتے ہیں ناں کہ نہیں صاحب، وہ تو خدا کا انکار ہی کرتے ہیں۔ بالکل Atheist واقع ہوئے ہیں۔ ان کو ہم خدا پرست کہتے ہیں ان کو ہم بھی مانتے ہیں خدا ماننے والے۔ اس لئے کہ ہم وہ ایک ہی جیسے تو ہیں۔ جیسا ہمارا ایمان ہے خدا پہ ویسے ہی ان کا ایمان ہے۔ خدا ماننے والے خدا کو خدا ماننے والے اور جو کچھ مل رہا ہے اس کے متعلق یہ نہیں ہے کہ یہ خدا کی طرف سے دیا ہوا ہے، اس کا ہے، اسے اپنی ملکیت سمجھنے والے۔ یہ شرک ہے عزیزان من۔ وہ کفر ہے، یہ شرک ہے۔ اور آج ساری دنیا یا کفر میں مبتلا ہے یا شرک میں مبتلا ہے۔ اللہ پر ایمان اس وقت آئے گا جب یہ ایمان ہوگا کہ **وما بکم من نعمت فمن اللہ** اور یہ ہوگی وہ جماعتِ مؤمنین، خدا پر ایمان رکھنے والے کہ جن کے ہاتھوں سے یہاں وہ معاشی نظام قائم ہوگا جو نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن کا معاشی نظام ہی قابل عمل ہے

جسے 1400 سال پیشتر قرآن نے دیا۔ جسے 1400 سال پیشتر قرآن پر عمل کر کے دکھانے والے رسولؐ نے عملاً نافذ کر کے دکھا دیا۔ جس پر محض فکری طور پر یہ سوچتے ہیں۔ میں نے کہا ہے، قرآن نے کہا ہے کہ تم **انفس و آفاق** کی ہماری نشانیوں پہ غور کرتے رہو **حتیٰ یتبین لھم انہ الحق**۔ اس طرح سے بھی تمہارے سامنے یہ حقیقت آجائے گی کہ قرآن نے جو کہا تھا، واقعی سچ کہا تھا۔ یہ دیکھئے کہ نہ ماننے والا مارکس جو ہے، وہ تاریخی تجربات کے اوپر، وہ بھی تو قرآن کا بتایا ہوا طریقہ ہے ناں۔ تاریخی شواہد سے کسی نتیجے پہ پہنچنا۔ عالمِ آفاق پہ غور و فکر سے کسی نتیجے پہ پہنچنا۔ وہ شخص اس نتیجے پہ تو پہنچ گیا کہ حل یہ ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی استطاعت کے مطابق جان مار کر کام کرے اور ہر شخص کو اس کی ضروریات کے مطابق ملے۔ اس پہ پہنچ گیا ہے۔ اس کی فکر اس کو اب آگے نہیں لے جا رہی۔ کہتا ہے میں یہ نہیں بتا سکتا۔ کہ وہ عمل میں کیسے آئے گا انسانوں کے۔ اس لئے کہ اس نے انسان کی انسانیت سے انکار کیا۔ کفر یہاں برتا ہے اس نے۔ انسان کی

انسانیت پہ ایمان اگر ہوتا تو وہ یہ کہتا کہ جو صلاحیتیں اس فرد کو حاصل ہیں' یہ بھی اس کی اپنی نہیں ہیں۔ جب یہ کہا تھا کہ یہ جن چیزوں کو' وسائل رزق کو یہ کہتا ہے میری ہیں' یہ اس کی اپنی نہیں ہیں۔ آگے ایک قدم بڑھتا وہ۔ اگر یہ ایمان اس کا آ جاتا **فمن اللہ** تو فرد کی صلاحیتیں کام کرنے کی بھی اس کی اپنی نہیں ہیں۔ وہ اس کا مالک نہیں ہے۔ یہ خدا کی ہے۔ اس کو یہ حل مل جاتا جہاں آ کے وہ عاجز ہو گیا عزیزان من۔ قرآن کی آیت سورہ نحل کی 53 اور 54 آیت' صرف ہمارے سامنے آئی۔ آپ نے دیکھا کہ کتنا اہم اور مشکل ترین مسئلہ اور قرآن چار لفظوں میں کس طرح سے حل کر دیتا ہے۔

؎ محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا

یہ ہے اصل چیز۔

ہاں ورنہ جو حجاب ہے' پردہ ہے ساز کا

یہ الفاظ کہ پردے کے اندر جو قرآن حقائق چھپا کے دے گیا ہے ان سے عزیزان من' یوں نہ آگے بڑھ جایئے۔ یوں نہ گزریئے صاحب۔ قرآن کا ایک ایک لفظ ایسا ہے کہ اس پہ کھڑے ہو کے آپ غور و فکر کیجئے۔ قرآن آج کے انسانوں کو' ان دنیا کے مسائل کو حل کرنے کے لئے آیا ہے عزیزان من۔ اس کے ہر دعوے میں انسان کی کسی نہ کسی مشکل' مصیبت اور پریشانی کا حل پوشیدہ آپ کو ملے گا اور وہ حل یہ ہے کہ یہ ایمان **وما بکم من نعمت فمن اللہ** یہ سب اس کا عطا کردہ ہے۔ میں اور میری صلاحیتیں یہ خارجی کائنات اور وسائل رزق بھی سارے اس کے ہیں۔ بس ایک میں اس کا ہو جاؤں تو سب میرا ہو جاتا ہے۔ کیا کہہ گیا ہے وہ بڑے حسین انداز میں جو کہا کرتا ہوں کہ

عشق میں ایک تم ہمارے ہو
باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

یہ سب کچھ اس کا دیا ہوا ہے۔ وہ اگر تمہارا ہو جاتا ہے تو تم اس کے مالک ہو جاتے ہو۔ اس اعتبار سے کہ اس کے دیے ہوئے قوانین کے مطابق ان کو صرف میں لایئے۔ یہ ہے قرآن کا معاشی نظام عزیزان من۔ اس ایمان کے ساتھ کوئی آئے اور آ کے بتائے کہ کس طرح یہ قابل عمل نہیں ہے؟ **(ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم)**

محققین قرآن سے لے کر عام طالب علم تک کے لئے ایک

اہم خوشخبری

محترم مفکر قرآن جناب پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی بصیرت یعنی لغات القرآن' مفہوم القرآن' تبویب القرآن اور قرآنی قوانین کو جو پانچ ہزار صفحات پر انسائیکلوپیڈیا کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے اسے بزم طلوع اسلام لاہور نے ایک ہی C.D. میں ایک خاص باہمی ربط کے ساتھ محفوظ کر دیا ہے۔

خواہش مند حضرات ادارہ طلوع اسلام' 25 بی' گلبرگ 2' لاہور سے صرف مبلغ 75 روپے میں علاوہ ڈاک خرچ طلب فرمائیں۔

المعجم المفہرس
لألفاظ القرآن الکریم

فواد عبدالباقی قیمت: -/500

یہ قرآنی آیات کا ایسا انڈیکس ہے جس سے آپ کسی بھی آیت کو چند ثانیوں میں تلاش کر سکتے ہیں۔ اس ایڈیشن کی امتیازی خصوصیات:

1- قرآن کریم میں استعمال ہونے والے تمام الفاظ اور ان کے بنیادی مادوں کی حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ فہرست شامل ہے۔

2- قرآن کریم کا مکمل متن بھی شامل ہے۔

تہذیبوں کا تصادم

سیموئل پی ہنٹنگٹن اردو ترجمہ: Clash of Civilizations قیمت: -/250

''تہذیبوں کا تصادم'' عصر حاضر میں عالمی سیاست کو چلانے والی قوتوں کا تجزیہ کرتی ہے اور یقینی طور پر پوری دنیا میں اس عشرے کی سب سے زیادہ موضوع بحث بننے والی کتاب ہے۔

سرسید احمد خان اور علوم اسلامیہ

مرتبہ: محمد یٰسین مظہر صدیقی قیمت: -/180

''میں صاف کہتا ہوں کہ اگر لوگ تقلید نہ چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن اور احادیث صحیح سے حاصل ہوتی ہے نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائے گا۔'' (سرسید، خط بنام محسن الملک)

دوست ایسوسی ایٹس

ناشران وتاجران کتب

الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور

Phone : 92 42 7122981, email: shahid_adil@yahoo.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علی محمد چدھڑ

منافقت

نفق۔ اس سرنگ کو کہتے ہیں جس کے داخل ہونے اور نکلنے کے دونوں راستے کھلے ہوں۔ جنگلی چوہے کے متعدد سوراخوں میں سے ایک کو کہتے ہیں جس پر وہ مٹی کی باریک پپڑی بچھا کر اسے بند رکھتا ہے اور اس وقت سر مار کر کھول لیتا ہے جب اس کا کوئی دشمن اسے بل کے اندر سے پکڑنے کی کوشش کرے۔

منافق۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی نظام یا سوسائٹی میں داخل ہونے سے پہلے دیکھ لے کہ اس کے قوانین سے بچنے کا راستہ کونسا ہے۔ معاشرہ میں منافق سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

ایک تو وہ لوگ ہیں جو دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ نظام خداوندی سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ یہ مومن ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو کھلے بندوں اس نظام سے باہر رہتے ہیں اور اس کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ انہیں کافر کہتے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو محض اپنی مطلب براری کے لئے جماعت کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ منافع میں ان کے برابر کے شریک رہتے ہیں اور جہاں کسی مشکل کا سامنا ہو تو یہ جماعت کا ساتھ چھوڑ کر صاف نکل گئے اور اس میں بددلی پھیلانے اور فتنہ پردازی کرنے لگ گئے' یہ منافق ہیں اور بدترین خلائق۔ اسی لئے قرآن کریم نے ان کا مقام جہنم کا سب سے نچلا طبقہ بتایا ہے۔

یاد رہے کہ منافقین کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا ہے۔ جب بھی کسی کی زبان اس کے دل سے ہم آہنگ نہ ہو یا اس کا کردار اس کے دعوے کی تصدیق نہ کرے۔ وہ نفاق کا مرتکب ہوتا ہے۔ قرآن نے اسے نفسیاتی مرض قرار دیا ہے۔ جماعت میں وسوسہ انگیزیاں کرنے والے۔ ان میں بزدلی پھیلانے والے۔ لوگوں کو دکھانے کی خاطر نیک کام کرنے والے' امت میں تفرقہ پیدا کرنے والے۔ مشکل کے وقت بہانے تراشنے والے' ہر وقت تنقیدیں اور اعتراض کرنے والے' کچھ دے کر احسان جتانے والے۔ یہ اعتراض کرنے والے کہ ہماری بات کیوں نہیں مانی جاتی۔ ہماری عرض کے مطابق پروگرام کیوں نہیں بنایا جاتا۔ جب اپنا فائدہ نظر آئے تو شریکِ پروگرام۔ جب منفعت نہ ہو تو کنارہ کش۔ یہ ہیں مختصراً وہ خصوصیات جن کے حامل منافق کہلاتے ہیں۔ جماعت پر تباہیاں آتی ہی منافقین کے ہاتھوں ہیں۔ ہماری ساری تاریخ اس کی شاہد ہے۔ قرآن کریم کے اس معیار کی رو سے ہمیں

اپنی حالت کا بھی جائزہ لینا چاہئے۔ کہ ہمارا مقام کیا ہے۔

اور یہ بھی یاد رہے کہ مکہ کے قریش کا وطیرہ کھلے دشمن کا سا تھا لیکن ہجرت کے بعد حضور نبی کریم ﷺ کو جن سے واسطہ پڑا وہ یہودی تھے اور ان کا مدینہ میں بڑا اثر و رسوخ تھا۔ اور پھر مصیبت پر مصیبت یہ کہ وہ لوگ قریش کی طرح کھلی دشمنی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ مار آستین بن کر ڈستے تھے۔ منافقت سے مسلمان ہو جاتے اور اس طرح ان کی جماعت میں داخل ہو کر سازشیں کرتے تھے۔ یہ سب سے بڑا فتنہ تھا۔ جو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے سینہ کا ناسور بن گیا تھا۔ قرآن کریم کو اگر ہم اٹھا کر دیکھیں تو اہل کتاب اور منافقین کی اسلام کے خلاف سازشوں کی انسانیت سوز داستانیں ہر جگہ بکھری ہوئی نظر آئیں گی۔ تفصیل کے لئے بات لمبی ہو جائے گی۔ بہرحال مختصر طور پر منافقین کے متعلق چند چیدہ چیدہ آیات قرآنی کا مفہوم پیش خدمت ہے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے فتنہ پردازوں کی اس بدترین قسم کی فریب کاریوں اور ظالمانہ حرکات کو بے نقاب کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) بلاشبہ منافق لوگ جہنم کے سب سے نچلے درجہ میں جائیں گے۔ (۴/۱۴۵)۔

(۲) منافقین آخرت میں ایمان کے لئے ترسیں گے۔ قیامت کے روز منافق مرد اور عوتیں اہل ایمان سے کہیں گے۔ ہم پر بھی ذرا نظر کرم کرو تاکہ ہم بھی تمہاری اس روشنی سے اکتساب ضیاء کر لیں۔ وہ کہیں گے کہ یہ چراغ تو عمل کے تیل سے ملتا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے تمہیں واپس دنیا میں جانا ہوگا۔ تاکہ عمل کے ذریعہ سے اسے روشن کر سکو۔ چونکہ واپس دنیا میں جانا ناممکن ہوگا لہٰذا ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی۔ جس کے اندر کی طرف رحمتیں ہی رحمتیں ہوں گی اور باہر کی طرف عذاب ہی عذاب ہوں گے۔ (۵۷/۱۳)۔

(۳) اگر یہ لوگ قوانین خداوندی سے گریز کی راہیں نکال کر معاشرہ میں فتنہ پیدا کریں تو انہیں گرفتار کر لو اور اگر اس سلسلہ میں ان سے جنگ کرنی پڑی تو ان سے لڑو اور جہاں پاؤ انہیں قتل کرو۔ اور ان میں سے کسی کو بھی اپنا دوست اور حمایتی تصور نہ کرو۔ (۴/۸۹)۔

(۴) کیا ان مذہبی پیشواؤں کے متعلق تم سمجھتے ہو کہ راہ راست پر آ جائیں گے۔ حالانکہ یہ اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو قوانین خداوندی کو سنتے اور سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر ایسی تبدیلیاں کر دیتے ہیں کہ بات کچھ کی کچھ بن جاتی ہے۔ نظام خداوندی پر یقین رکھنے والوں کے سامنے تو یہ مومن بنے رہتے ہیں لیکن جب آپس میں ایک دوسرے سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تمہیں احتیاط برتنی چاہئے کہ اللہ کے وہ قوانین عام لوگوں کے سامنے نہ آنے پائیں جو ہمارے ہی خلاف استعمال ہو سکیں۔ لہٰذا اس معاملہ میں عقل سمجھ سے کام لینا چاہئے۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ جسے وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں۔

ان کے متبعین وہ جہلا ہیں جو خود اللہ کے قوانین کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ محض توہم پرستیوں اور قیاس آرائیوں میں مست رہتے ہیں اور یہ بدانجام لوگ اپنے ذہن سے شریعت کے احکام وضع کرتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ یہ

اللہ کی طرف سے ہیں اس طرح اپنے لئے حقیر حقیر فائدے حاصل کرتے ہیں۔ حیف اس شریعت پر جسے یہ اس طرح وضع کرتے ہیں۔ اور صد حیف ہے اس کمائی پر جسے یہ اس کے بدلے میں حاصل کرتے ہیں۔ (۷۹-۷۵/۲)۔

(۵) ان لوگوں نے اللہ کے قوانین کو فروخت کر دیا ہے۔ معمولی معمولی فائدوں کے عوض اور نظام خداوندی کے سامنے رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ بہت ہی برا ہے جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں۔ (۹/۹)۔

(۶) جب یہ لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نظام خداوندی پر ایمان لے آئے حالانکہ یہ کفر کی حالت میں آئے تھے اور کفر کی حالت میں چلے گئے۔ جو کچھ یہ چھپاتے ہیں اللہ کو اس سب کا علم ہے۔ ان کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ جرائم اور حرام خوری میں سب سے تیز ہیں۔ کیا ہی برے ہیں یہ کام جنہیں یہ لوگ کرتے چلے جاتے ہیں اور دیکھو کہ ان کے پیرار ملا بھی انہیں ان جرائم اور حرام خوری سے نہیں روکتے۔ انہوں نے مذہب کو کاروبار بنالیا ہے۔

کس قدر گھناؤنا ہے ان کا یہ کاروبار۔

☆☆☆

کہاں جاؤں یہاں ہے قحط میرے ہم خیالوں کا
اُلجھنا چاہتا ہُوں دورِ حاضر کے خداؤں سے
ابھی تک تیغِ استبداد کے شعلوں میں دم خم ہے
ابھی تک بُوئے خُوں آتی ہے سُلطانی قباؤں سے

ایک عظیم تاریخی دستاویز

انٹرنیشنل اسلامک کلیوکیم، منعقدہ 29 دسمبر 1957ء تا 8 جنوری 1958ء

﴿لاہور میں پڑھے گئے اردو، انگریزی اور عربی مقالات کا مجموعہ﴾

علامہ غلام احمد پرویز، سید ابوالاعلیٰ مودودی، شیخ امین احسن اصلاحی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور ابوزہرہ مصری کے علاوہ تقریباً چالیس ممالک کے نامور سکالرز کے افکار کا گلدستہ۔

امپورٹڈ گلیز پیپر۔ بڑے سائز کے ساڑھے پانچ سو صفحات۔ محدود تعداد میں دستیاب ہے۔

عام قیمت -/450 روپے **رعایتی قیمت** -/250 روپے علاوہ ڈاک خرچ۔

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لئے خوشخبری

(نایاب) آسان قرآن مجید (نیوز)، مع تفسیر القرآن بالقرآن (محدود تعداد میں)

از۔ تلمیذ سرسید جناب علی احمد خان دانشمند جالندھری (علیگ)

رعایتی قیمت پر -/200 روپے کی بجائے صرف -/100 روپے میں طلب کریں (علاوہ ڈاک خرچ)

ملنے کا پتہ :- مکتبۂ اخوت، اخوت سنٹر نیو اردو بازار نزد مچھلی منڈی، لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ڈاکٹر شبیر احمد، ایم ڈی، فلوریڈا

ہمارے قائداعظمؒ

﴿آخری قسط﴾

اب ذرا غور فرمایئے (۱۹۴۳ء میں) ہری جن لیڈر راؤ بہادر ایم سی راجا کے بیان پر۔ انہوں نے لکھا ''تمام مذاہب اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا وقتاً فوقتاً اپنے چنے ہوئے بندے دنیا میں بھیجتا ہے تاکہ اس کے منصوبے تکمیل کو پہنچیں۔ ایسا خصوصاً تاریخ کے نازک مقامات پر ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں مسٹر جناح وہ شخص ہیں جنہیں خدا نے اس لئے مقرر کیا ہے کہ وہ ہندوستان میں مسٹر گاندھی کی لیڈرشپ میں ہونے والی کانگریس کی غلط روی کا ازالہ کریں۔ گاندھی کی تحریک عدم تعاون کے مقابلے میں جناح کی سچی اور کھری حکمت عملی کہیں زیادہ قابل قدر ہے۔ گاندھی اور کانگریس کے طور طریقوں نے ہندوستانیوں کو صرف ہندو اور غیر ہندو میں ہی تقسیم نہیں کیا بلکہ ذات پات کی بنیاد پر استوار ہندو سماج نے ہری جنوں کو ایک خوفناک خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔ جناح سچ کہتے ہیں کہ کانگریس پورے ہندوستان کی نمائندگی نہیں کرتی۔ اس طرح مسٹر جناح ہم ہری جنوں کے حقوق کی پاسداری بھی کر رہے ہیں۔''

۱۹۳۹ء میں جناح عارضی طور پر مالا بار ہل منتقل ہو گئے۔ ۱۳ برس بعد ۱۹۵۲ء میں ہیکٹر بولیتھو مالا بار ہل کے اس علاقہ میں کئی مقامی باشندوں سے اور ایک آرکیٹیکٹ کلاڈ بیٹلی (جس نے قائداعظمؒ کا مکان بنایا تھا) سے ملا۔ ہیکٹر لکھتا ہے کہ نہ صرف اس علاقہ کے مکین آج تک جناح کو بڑی محبت سے یاد کرتے ہیں بلکہ آج تک ان کے گھر کو ''جناح ہاؤس'' کہتے ہیں ہر چند کہ وہاں اب برطانوی ڈپٹی ہائی کمشنر رہتا ہے۔

قائداعظمؒ کا خصوصی سٹاف ان کی نئی وسیع و عریض کوٹھی میں ان کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ان کے ملازم کہتے ہیں کہ ہر چند قائداعظمؒ ہر کام بالکل درست اور ڈھنگ سے کیا ہوا دیکھنا چاہتے تھے اور وہ خاموش طبع انسان تھے لیکن ان کے بے داغ کردار کی وجہ سے کوئی ملازم ان سے خیانت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کلاڈ بیٹلی نے کہا جب یہ کوٹھی بن رہی تھی تو قائداعظمؒ ذاتی دلچسپی سے اس کی تعمیر کا جائزہ لیتے تھے ان کا حسنِ ذوق غیر معمولی تھا اور ان کے تعمیراتی مشورے حیران کن

حد تک درست ہوتے تھے۔ (وہ ایک عمارت سے لے کر ملک تک ہر چیز ضابطوں کے تحت بنانے کے قائل تھے)۔

روزمرہ کے معمولات بھی قائداعظمؒ اصولوں کے تحت نمٹاتے تھے اور ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد یا ابہام نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار دیوان چمن لال نے قائداعظمؒ سے پوچھا "کیا میں گاندھی سے کہوں کہ آپ ان سے ملنا چاہتے ہیں۔" قائداعظم نے جواب دیا "نہیں! وہ چاہیں تو میں مل لوں گا لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے
خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے

بمبئی میں قائداعظم نے اپنے گھر کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا آفس بنا رکھا تھا۔ اس دفتر کی تنہائی میں برصغیر کے مستقبل کے فیصلے ہوتے تھے۔ لیاقت علی خان قائداعظم کو مختلف صوبوں کے دوروں پر لے جاتے تھے۔ ان دوروں کے درمیان قائداعظمؒ مختصر خطوط کے ذریعے مسلم لیگ کے کارکنوں کو ملک بھر میں یوں ہدایات دیتے تھے جیسے کوئی فوجی جنرل میدان جنگ میں کمان کرتا ہو۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ ملک کے ۹۵ فیصد اخبارات ہندوؤں اور انگریزوں کے ہاتھ میں ہیں جناح نے اپنا انگریزی اخبار ڈان "DAWN" نکالنا شروع کیا۔ اس اخبار نے مسلمانوں کے مخالف پروپیگنڈے کا بڑی خوبی سے مقابلہ کیا۔ اخبار نکالنے کے بعد بھی ان کی عادت رہی کہ صحافیوں کو یا رپورٹرز کو چائے کا کپ یا سگریٹ بھی یہ سوچ کر پیش نہیں کرتے تھے کہ کہیں اسے رشوت نہ سمجھا جائے۔

۱۹۴۲ء میں جب کانگریس نے برصغیر میں انگریزوں کے خلاف کھلی بغاوت کا ماحول پیدا کر دیا تو قائداعظمؒ نے کمال بصیرت سے مسلم لیگ کو اپنی توانائیاں ضائع کرنے سے بچا لیا اور اپنی آئینی جدوجہد کو آگے بڑھاتے رہے۔

۲۶ جولائی ۱۹۴۳ء کی بات ہے کہ ایک تیس سالہ شخص رفیق صابر مزنگوی دوپہر سوا ایک بجے قائداعظم کی مالابار ہل والی کوٹھی میں داخل ہوا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا باریش خاکسار تھا۔ اس نے آتے ہی سیکرٹری سے کہا کہ وہ قائداعظمؒ سے ملنا چاہتا ہے۔ سیکریٹری نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ بہت مصروف ہیں کہ رفیق اچانک قائداعظمؒ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ قائداعظمؒ کی توجہ اپنے کاغذات پر تھی۔ رفیق نے اچانک ان کے چہرے پر ایک مکا مارا اور پھر کمر سے ایک تیز دھار چاقو نکال لیا۔ ۶۷ سالہ نحیف جناح نے بغیر گھبراہٹ کے رفیق کی کلائی پکڑ لی۔ قائداعظمؒ کا ڈرائیور اور دیگر افراد پہنچ گئے۔ چند ہی لمحوں بعد قائداعظمؒ دوبارہ اپنے کام میں یوں مشغول ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ رفیق خاکسار پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ انگریز جج نے اسے پانچ سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ خاکسار تحریک اس زمانے میں انگریزوں کے خلاف کھلی بغاوت کر دینے کی قائل تھی اور مسلم لیگ سے انہیں اختلاف تھا۔

ان دنوں چند ہی مصنفوں اور اخبار نویسوں کو قائداعظمؒ سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ ان میں ایک انگریز

''بیورلی نکلز'' شامل ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''انڈیا پر حرف آخر'' میں قائداعظمؒ پر جو صفحات لکھے ہیں ان کے عنوان پر غور فرمایئے۔ ''ایک دیو سے مکالمہ'' ان صفحات میں بیورلی نے قائداعظمؒ کو ایشیا کی اہم ترین شخصیت قرار دیا ایک سوال کے جواب میں قائداعظمؒ نے بیورلی سے کہا ''میں کوئی وجہ نہیں دیکھ سکتا کہ پاکستان کے عوام عزم اور محنت کے ساتھ خوشحال قوموں کی برادری میں نمایاں مقام حاصل نہ کرسکیں۔''

قائداعظمؒ کے اقوال میں اس لئے قوت اور تاثیر ہوتی تھی کہ وہ خود ایک انتہائی زبردست قوتِ ارادی رکھنے والے انسان تھے۔ بمبئی کا ایک ڈاکٹر جسے گاندھی اور جناح دونوں کا علاج کرنے کا اعزاز حاصل ہے کہتا ہے ''گاندھی قوت کا ہتھیار تھے لیکن جناح بذات خود قوت تھے۔'' جناح کے دوسرے ڈاکٹر (جو پارسی تھے) سرجن کمانڈر جل پٹیل کہتے ہیں کہ آرام قائداعظمؒ کی زندگی کا حصہ نہیں تھا۔ ایک بار میں نے ان کا علاج کیا' اخبارو ں میں خبر چھپ گئی۔ میں گھبرایا ہوا مسٹر جناح کے پاس گیا۔ دیکھئے نہ جانے کس بے وقوف نے یہ حرکت کی ہے۔ مسٹر جناح بولے'' وہ بے وقوف میں ہوں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص اتنی دلجمعی سے میری خدمت کرے اور میں اس کا اظہار نہ کروں۔''

آیئے اب ذرا ان پیمانوں پر نظر ڈالتے ہیں جن کی رو سے دوقومی نظریہ کی وضاحت ہوتی ہے اور مسلم اور ہندو جداگانہ قوم ٹھہرتے ہیں۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۴۴ء کو جناح نے گاندھی کو جو خط لکھا اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

''(ہندوستان کے) مسلمان (ہندوؤں سے) جداگانہ قوم ہیں کیونکہ ہمارا کلچر اور تہذیب علیحدہ ہے۔ ہم علیحدہ زبان' ادب' آرٹ اور تعمیرات کے حامل ہیں۔ ہمارے نام' ہماری اخلاقی قدریں' عدالتی قوانین' سماجی ضابطے' رسوم اور روایات اور کیلنڈر بھی جدا ہیں۔ ہماری تاریخ اور ہماری مستقبل کی امنگیں' مختصراً یہ کہ ہمارا طرز زندگی علیحدہ شناخت رکھتا ہے۔ ہمارے اکثر ہیروز کو ہندو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ قومیں نظریات کی بنیاد پر تشکیل پاتی ہیں۔ بین الاقوامی قانون کے ہر ضابطے کی رو سے ہم قوم واحد ہیں۔''

(قائداعظمؒ کے نکتہ چیں، یہاں یہ نکتہ نوٹ فرمالیں کہ ان کے افکار کس گہرائی تک قرآن حکیم کی تعلیمات سے مطابقت رکھتے تھے۔)

نوابزادہ لیاقت علی خان قائداعظمؒ کے مشن میں ان کے دستِ راست بنے رہے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے معاملات اور خزانے کی دیکھ بھال انتہائی فراست سے کی۔ لیاقت ہر چند کہ جاگیردار گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن انہیں قدرت سے تنظیم اور لیڈرشپ کا وصف خصوصی طور سے عطا ہوا تھا۔ ہر چند کہ قائداعظمؒ کو غیروں نے مسلم لیگ کا آمر مطلق سمجھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں اور خصوصاً لیاقت علی خان سے مسلسل مشورہ کرتے رہتے تھے۔ ایک بار مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے رائے پیش کی کہ سالانہ پارٹی انتخابات کو چھوڑ کر قائداعظمؒ تاحیات صدر ہونا منظور کرلیں۔ قائداعظمؒ نے صاف جواب دیا ''ہرگز نہیں! مجھے ہر سال اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے لئے آپ کے سامنے آنا

چاہئے۔'' یہ تھا ان کی دیانت داری کا عالم۔

صاحبو! ہیکٹر لکھتا ہے ''جناح کی آنکھیں گویا سچائی کے دو روشن چراغ تھیں۔ صرف دیانتدار شخص ہی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکتا تھا۔''

ایک دبلے پتلے جسم کے اندر چھپے ہوئے جناح اتنے طاقتور انسان تھے کہ وہ جب چاہتے بڑے سے بڑے فرد پر یا ہجوم پر چھا جاتے تھے۔ بیگم رعنا لیاقت علی یاد کرتی ہیں کہ ''وہ بڑے سے بڑے شخص کو بلا تکلف انگلی لہراتے ہوئے کہہ دیتے تھے۔ ''آپ بے کار بات کر رہے ہیں۔'' اور مخاطب بلا استثنیٰ خاموش ہو جاتا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ بھرے جلسوں سے انگریزی میں خطاب کرتے تھے لیکن عوام ان کی بات سحر زدہ ہو کر سنتے تھے۔''

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو میں پیدا من و تو سے پاک

صاحبو! آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ قائداعظمؒ کی سوانح حیات میں ہر کس و ناکس کے لئے جذبہ اور عمل کی کیسی کیسی تحریک اور مہمیز موجود ہے۔ بڑی سے بڑی مشکلات کو خاطر میں لائے بغیر منزل کی جانب رواں دواں رہنا، فکر کی پختگی اور گہرائی اور کردار کی پاکیزگی۔۔۔ وطن کے عوام اور خواص کے لئے قائداعظمؒ مشعلِ راہ ہیں۔ اسی دوران خبر آئی ہے کہ ان کی زندگی پر ایک فلم کی شوٹنگ شروع ہوگئی ہے۔ خدا کرے قائداعظمؒ کی عظمت سے انصاف ہو سکے۔ بڑے انسان پر فلم بنانا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ اب آیئے پھر ہیکٹر بولیتھو کی جانب۔

جنوری ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کی زبردست کامیابی قائداعظمؒ کی زندگی کی خوشگوار ترین ساعت تھی۔ وقت نے دشمنوں پر بھی ثابت کر دیا تھا کہ جناح کے اندازے اور فیصلے درست تھے۔ کلکتہ میں مسلم لیگ کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا ''دیکھئے! میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ خدا نے مجھے دنیا کی ہر آسائش عطا کی ہے۔ میں اپنا خون پسینہ ایک کیوں کرتا ہوں؟ آپ کے لئے، غریبوں کے لئے'' ایک صاحب نے پوچھا پاکستان میں نہ کوئلہ ہے نہ لوہا، نہ صنعتیں ہیں نہ کافی بجلی! قائداعظمؒ نے جواب دیا۔ ''میں یہ بات بخوبی جانتا ہوں لیکن میری قوم کو موقع دیا گیا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ عزم راسخ اور مسلسل محنت سے یہ سب چیزیں حاصل نہ کر لے۔ یاد رکھیئے میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہوں گا خواہ اس میں میری جان جاتی رہے۔''

زندگی کے آخری دو تین سالوں میں قائداعظمؒ پر بار بار برونکائٹس (کھانسی اور بخار) کے حملے ہونے لگے تھے۔ ضعیفی اور بیماری کے باوجود ان کی آن بان میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ستر برس کی عمر میں وہ اپنی عمر کے اعتبار سے چال ڈھال اور نشست و برخاست میں کم رفتار نہیں ہوئے تھے۔ ان کا وقار اور خود اعتمادی آخر دم تک جواں رہی۔ ۱۹۴۶ء میں بمبئی کے گورنر نے اپنی سیکریٹری کے ذریعے قائداعظمؒ کو فون کیا۔ انہوں نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا کہ ''اگر انگریز گورنر فون پر آنے کے لئے بڑا آدمی ہے تو میں بھی بڑا آدمی ہوں۔'' ان کے نزدیک بڑا کون تھا؟ فرمایا ''اگر ہمیں

کبھی مدد کی ضرورت ہوئی تو ہم (خدا کے بعد) صرف مسلم قوم سے رجوع کریں گے۔''

۱۹۴۶ء میں بمبئی میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تو اس میں برطانوی حکومت اور کیبنٹ مشن کے خلاف قائداعظمؒ نے راست اقدام (ڈائریکٹ ایکشن) کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنی جدوجہد کے اس مرحلے پر جیل جانے کو بھی تیار ہیں۔ ایک ۷۵ سالہ شخص اٹھ کھڑا ہوا اور جذباتی انداز سے بولا ''قائداعظمؒ پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے پولیس کو میرے سینے پر گولی چلانی ہوگی۔'' ہیکٹر بولیتھو بڑے متاثر کن انداز میں لکھتا ہے کہ جناح انڈیا کے ان گنے چنے افراد میں تھے جو بخوبی سمجھتے تھے کہ زندگی میں کبھی ایسے مقامات بھی آتے ہیں جب جان دینا آسان ہوتا ہے اور جرأت کے ساتھ اپنی منزل کی جانب بڑھتے رہنا مشکل لہٰذا انہوں نے کارکنوں کے جذبات کبھی بھڑکنے نہیں دیئے۔

اس دور کے بارے میں انگریز گورنر بنگال آر جی کیسی لکھتا ہے ''قائداعظمؒ اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقدمہ بڑی مہارت سے لڑ رہے ہیں۔ ان کی شخصیت اور قابلیت ایسی ہے کہ وہ بذاتِ خود مسلم لیگ ہیں۔ ان کی بات میں کبھی الجھاؤ یا ابہام نہیں ہوتا۔ میں نے ان کے سامنے ایک شخص پر تنقید کرتے ہوئے اسے کٹر کہہ دیا۔ جناح فیصلہ کن انداز میں بولے ''کٹر پن کو برا نہ کہئے اگر میں دُھن کا پکا نہ ہوتا تو پاکستان کبھی وجود میں نہ آتا''۔ (یہ بات مارچ ۱۹۴۸ء میں کراچی کے گورنمنٹ ہاؤس کی ہے۔) ''بشمول جواہر لال نہرو ہندو لیڈر الفاظ کے ہیر پھیر کے عادی تھے جب کہ جناح الفاظ کے پیچھے مضمر اصولوں پر توجہ دیتے تھے۔''

قائداعظمؒ کے تمام تر سیاسی اصول آزادیٔ وطن اور عام آدمی کی فلاح کے لئے وقف تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو ذہن نشین کروا دیا تھا کہ وہ ''عام آدمی کے فائدے کے لئے کام کریں نہ کہ پارٹی کے مقاصد کے لئے۔''

قائداعظمؒ نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ مسلمانانِ ہند کی فلاح اور حصول پاکستان کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ ۳ دسمبر ۱۹۴۶ء کو وائسرائے لارڈ ویول، نہرو، بلدیو سنگھ، لیاقت علی خان اور جناح ایک ہی طیارے میں لندن کے لئے روانہ ہوئے۔ ٹائم میگزین کے صحافی نے ماسکے ہوائی اڈے پر نہرو کو یہ کہتے ہوئے سنا ''میرا سفر کچھ بڑھتے، کچھ سوتے اور کچھ چہل قدمی کرتے گزر رہا ہے۔'' جناح نے یہ وقت ایک خاص کتاب کا مطالعہ کرنے میں صرف کیا جس کا عنوان تھا ''ایک قوم جس سے دغا کی گئی۔'' لندن میں مسلم لیگ کی بھرپور وکالت کرتے ہوئے انہوں نے کہا ''جسے آپ جمہوریت کہتے ہیں وہ تو مسلمانوں کے لہو میں رچی بسی ہوتی ہے۔ کیا اتنی مثال کافی نہیں کہ جب میں مسجد جاتا ہوں تو میرا شوفر میرے پہلو میں کھڑا ہوتا ہے۔'' اس طرح کے پرزور دلائل سے برطانوی حکومت اور عوام کو قائل کرنے کے بعد فروری ۱۹۴۷ء میں قائداعظمؒ برطانیہ سے واپس آ گئے۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے ڈاکٹروں کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے ملیر، کراچی میں ایک ماہ آرام کیا۔

لیکن منزل قریب ہوتے ہوئے بھی قریب نہیں تھی۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں ہٹ دھرم اور ہندو پرور ماؤنٹ بیٹن

ہندوستان کا نیا وائسرائے بن کر دہلی آ گیا۔ جناح اب ستر سال کے ہو چکے تھے اور ان کے اکثر مخالف ان سے کم عمر اور صحت مند تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کی عمر ۴۶ سال کی تھی اور پنڈت نہرو کی ۵۷ سال۔ یہ جناح کا کردار تھا اور زبردست قوت ارادی جس کے طفیل انہیں اپنے مشترکہ مخالفین پر شاندار فتح حاصل ہوئی۔ ''دی اسٹیٹس مین'' کے ایڈیٹر ''ائین سٹیفنس'' نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں لکھا ''لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن پکے ہندو پرور ہیں اور وہ سیاست ہند کو ہندوؤں کی عینک سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ وائسرائے اور ان کی بیوی مسلم لیگ' پاکستان اور قائداعظمؒ کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔''

ہندوؤں اور انگریزوں کی مشترکہ سازشوں کے مقابلے میں قائداعظمؒ کی لیڈرشپ میں مسلم لیگ نے یہ کمال کر دکھایا کہ کانگریس کا پیسہ مسلمانوں کے جذبوں کی آگ میں پگھلتا ہوا نظر آنے لگا۔

اپریل ۱۹۴۷ء میں ملک بھر میں جگہ جگہ ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ایما پر قائداعظمؒ اور گاندھی نے امن کی اپیل پر دستخط کئے اور یہ اپیل ریڈیو' اخبارات اور سینما کے ذریعے خصوصاً پنجاب میں مشتہر کی گئی جہاں ماسٹر تارا سنگھ نے سکھوں کو مشتعل کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کا نام و نشان سرزمین پنجاب سے مٹا دیں۔ بعض مسلم زعماء نے قائداعظمؒ سے درخواست کی کہ وہ سکھوں سے لڑنے کے لئے رضاکار بھیجنے کی اجازت دیں۔ (قرآنی احکام کے عین مطابق پابندیٔ عہد کی مثال دیکھئے۔) قائداعظمؒ نے جواب دیا ''میں منافق نہیں ہوں۔ میں نے ابھی ابھی امن کی اپیل پر دستخط کئے ہیں۔ میں ہندوستان کے مسلمانوں سے امن کی توقع کرتا ہوں۔''

لیکن کانگریس کی پالیسیاں ہندوستان کے امن کو نئے نئے خطروں سے دوچار کر رہی تھیں۔ دوران گفتگو ایک دن قائداعظمؒ نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا ''صاف بات ہے ہندو (لیڈرشپ کو سمجھانا) ناممکن ہے۔ وہ ہمیشہ ایک روپے کے سترہ آنے مانگتے ہیں۔''

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک بار فوری عہد چاہتے ہوئے اور دھمکی دیتے ہوئے کہا ''مسٹر جناح! کہیں آپ کا مطالبہ پاکستان آپ کی بے لچک پالیسی کی نذر نہ ہو جائے۔'' (قائداعظمؒ اس مرحلے پر مسلم لیگ کونسل سے مشورہ کئے بغیر وائسرائے کو قول دینا غیر آئینی سمجھتے تھے۔) لہٰذا انہوں نے بے اعتنائی سے کہا ''جو ہونا ہے وہ (قاعدے قانون کے مطابق) ہونا چاہئے۔'' جو ہونا چاہئے تھا وہ پھر یوں ہوا کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو قائداعظمؒ نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے قوم کو آزادی کا مژدہ سنا دیا اور پہلی بار ریڈیو سے ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ گونجا۔ برصغیر کے مسلمانوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔

آنے والے دنوں میں ۱۴ ملین انسانوں کو مشرقی اور مغربی پاکستان کی سرحد پار کرنی تھی۔ سردار پٹیل اور چودھری محمد علی کی نگرانی میں اثاثوں اور املاک کی تقسیم کا ریکارڈ لکھا جانے لگا۔ بھاری فوجی ساز و سامان سے لے کر کرسی میز اور ٹائپ رائٹرز تک پاکستان اور ہندوستان میں ایک اور چار کی نسبت سے تقسیم ہونا تھے۔ حکومت ہند اور ان

کے کارپردازوں نے اس بارے میں اتنی دھاندلی مچائی کہ انگریز فیلڈ مارشل ''کلاڈ آکنلیک'' نے برطانوی حکومت کو لکھ بھیجا ''مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ہندوستانی کابینہ پوری کوشش کر رہی ہے کہ پاکستان قائم نہ رہ سکے۔''

حکومت ہند کی بددیانتی کی ایک مثال دیکھئے کہ اسلحہ کی تین سو اسپیشل ٹرینیں پاکستان پہنچنی تھیں لیکن صرف تین پہنچیں وہ بھی کوڑے کرکٹ سے لدی ہوئی۔ یہاں تک کہ ہسپتالوں کے لئے مخصوص طبی ساز و سامان بھی ہندوستان میں روک لیا گیا۔ صرف قائداعظمؒ کی ولولہ انگیز قیادت میں مسلمانوں کا جذبۂ آزادی وہ دولت تھا جسے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی تھی۔

۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظمؒ محمد علی جناح نے دہلی سے کراچی کے لئے پرواز کی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے آخری دم تک کوشش کی کہ وہ پاکستان کے گورنر جنرل بھی نامزد کر دیئے جائیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بناتے ہوئے اتنا بھی نہ سوچا کہ ایک شخص بیک وقت دو ملکوں کا گورنر جنرل کیسے ہو سکتا ہے۔ جہاز رن وے پر دوڑنے لگا تو قائداعظمؒ نے اطمینان کا سانس لیا ''منزل کی جانب میرا طویل سفر مکمل ہو گیا۔''

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

☆☆☆

اسٹینلے وولپرٹ کے بقول قائداعظمؒ نے صرف جغرافیہ ہی نہیں بدلا تھا' صرف تاریخ کا رخ ہی نہیں موڑا تھا بلکہ پاکستان کے نام سے ایک قوم و ملک کی بنیاد بھی رکھ ڈالی تھی۔

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

دہلی سے کراچی کی پرواز چار گھنٹے جاری رہی۔ ان کے نیول اے۔ ڈی۔ سی لیفٹیننٹ ایس ایم احسن اور فضائی اے۔ ڈی۔ سی عطار بانی سلور ڈکوٹا طیارے میں قائداعظمؒ کے ساتھ تھے۔ ان چار گھنٹوں کے دوران وہ بڑے انہماک سے اخبارات پڑھتے رہے جو ان کی کامرانیوں کے بیانات سے بھرے ہوئے تھے۔ لیکن قائداعظمؒ کی شخصیت ایسا سمندر تھی جس میں جذبات کے بلبلے ابھر نہیں سکتے تھے۔ جہاز جب کراچی کی فضاؤں میں داخل ہوا تو زمین پر سفید کپڑوں میں ملبوس انسانوں کا ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر نظر آیا۔ اے۔ ڈی۔ سی کہتے ہیں انہیں دیکھتے ہی قائداعظمؒ میں نوجوانی کی لہر دوڑ گئی۔ طیارہ ٹھہرا تو پہلے قائداعظمؒ اور ان کے پیچھے مس فاطمہ جناح اتریں۔ ''پاکستان زندہ باد!'' کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ اسی ہجوم میں نان جی جعفر اور فہ لمہ بائی ۵۸ برس پرانی یادیں تازہ کر رہی تھیں۔ ''جناح خاک سے اٹھ کھڑا ہوا تھا تاکہ اس کے کپڑے میلے نہ ہوں اور اس کے ہاتھ بڑے کام کرنے کے لئے صاف رہیں۔''

گورنمنٹ ہاؤس پہنچ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے قائداعظمؒ نے لیفٹیننٹ احسن سے کہا ''جانتے ہو مجھے اپنی زندگی میں پاکستان دیکھنے کی امید نہیں تھی۔ ہمیں اپنی کامیابی پر خدا کا بہت شکر گزار ہونا چاہئے۔ کراچی میں گورنر سندھ کی

رہائش گاہ کو پاکستان کا پہلا گورنمنٹ ہاؤس بنا لیا گیا تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس کے جائزے اور کچھ چہل قدمی کے بعد قائداعظمؒ نے حالات حاضرہ سے باخبر رہنے کے لئے پہلی فرمائش ریڈیو سیٹ کے لئے کی اور آرام کرنے کے مشورے کو مسترد کر دیا۔

صاحبو! ہیکٹر انتہائی حیرت سے لکھتا ہے کہ پاکستان کا ملکی نظام سنبھالنے والے افراد اتنے پرجوش تھے کہ انہوں نے گویا راتوں رات مرکزی حکومت کی بنیادیں استوار کر دیں۔ بیوروکریسی دفاتر' کرسیاں' میزیں' کاغذ' پنسل' ٹیلیفون کی تاریں' ٹائپ رائٹریوں سمجھئے کہ تنکا تنکا چن کر آشیانہ بنانا تھا۔ آشیانہ راتوں رات کچھ اس انداز سے بنا کہ وہاں موجود برطانوی باشندے بھی دنگ رہ گئے۔

ایک انگریز نے ہیکٹر کو بتایا کہ کراچی سے دو میل دور شٹنگ کے دوران ایک ٹرین پٹری سے اتر گئی تھی۔ آدھے گھنٹے کے اندر مدد گار ٹرین پہنچ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مزدوروں نے ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگاتے ہوئے اتری ہوئی ٹرین کو واپس پٹری پر ڈال دیا۔ میں نے جوش و جذبہ کا ایسا منظر پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ اس لمحہ سے مجھے یقین ہے کہ یہ قوم پائندہ رہے گی۔

۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظمؒ نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''آپ آزاد ہیں۔ آپ اپنے معبدوں' مسجدوں میں جانے کے لئے آزاد ہیں۔ آپ کا تعلق کسی مذہب' ذات اور رنگ و نسل سے ہو ہم سب پاکستانی شہری کی حیثیت سے برابر ہیں۔'' ہیکٹر لکھتا ہے کہ تقریر کے الفاظ بلاشبہ قائداعظمؒ کے تھے لیکن ان کے پیچھے فکر اور عقیدہ وہ تھا جو تیرہ سو برس پہلے پیغمبر اسلامؐ نے سکھایا تھا۔ ''خدا کے سامنے سب انسان برابر ہیں۔ تمہاری جانیں اور مال ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ میں دورِ جاہلیت کے رنگ و نسل کے تمام نشان آج اپنے قدموں کے نیچے پامال کرتا ہوں۔''

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مملکتِ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کا حلف اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر قائداعظمؒ نے تمام پاکستانیوں سے باہمی اخوت اور بھائی چارے کی اپیل کی۔ انہوں نے کہا ''پاکستان کے تمام شہریوں کے حقوق ہی نہیں فرائض بھی یکساں ہوں گے۔'' (صوبہ' فرقہ اور زبان یہاں تک کہ عقیدوں کے فرق پاکستان کی سرحدوں میں مٹ گئے تھے۔)

پاکستان کی لیڈرشپ کو اقلیتوں کے حقوق کا اتنا خیال تھا کہ قائداعظم اور لیاقت علی خان نے ملک کے لئے بہ نفس نفیس وہ پرچم چنا جس میں سبز رنگ مسلم اکثریت کی علامت تھا تو سفید اقلیتوں کا نشان! ۱۴ اگست کو اہل پاکستان کی مسرتیں ناقابل بیان تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سات کروڑ انسانوں کے ساتھ فضائیں بھی آزادی کے گیت گا رہی ہیں۔ (جی ہاں نو آزاد مغربی اور مشرقی پاکستان کی کل آبادی سات کروڑ تھی۔)

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو مملکت پاکستان کی پہلی کابینہ نے حلف اٹھایا۔ سفید شیروانی' جناح کیپ اور اپنے مخصوص مونوکل کے ساتھ قائداعظمؒ ہمیشہ سے زیادہ ہشاش بشاش لگ

رہے تھے۔تقریب حلف برداری شروع ہونے لگی تو اے ڈی سی نے درخواست کی کہ قائداعظمؒ کھلے لان میں نہ جائیں کیونکہ بادل کچھ گھر کر آ رہے تھے۔ قائد نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ بادلوں پر ڈالتے ہوئے کہا ''نہیں! میں ان بادلوں کو (بچپن سے) پہچانتا ہوں۔ کراچی کے ان بادلوں میں پانی نہیں ہوتا۔'' انہوں نے بجا فرمایا تھا۔ شاید وہ انسانوں کی نفسیات کی طرح موسم کے مزاج کو بھی اوروں سے بہتر سمجھتے تھے۔

صاحبو! پاکستان کا قیام تاریخ عالم کا بہت بڑا واقعہ تھا۔ یہاں پہنچ کر ہیکٹر قائداعظمؒ کی عظمت کا اعتراف یہ لکھ کر کرتا ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں کے بانیوں بشمول واشنگٹن، اٹلی کے ''کیوور'' اور جرمنی کے ''بسمارک'' محمد علی جناح ایک ایسے یکتا لیڈر تھے جنہوں نے اپنا مقصد بلند بغیر لشکر و سپاہ کے اور بغیر فوج و جنگ کے حاصل کیا۔ البتہ وطن عزیز کے قیام کے ساتھ ہی انہوں نے مضبوط مسلح افواج کے قیام کا بیڑا اٹھا لیا۔ وہ کہتے تھے کہ قوموں کو اپنی آزادی قائم رکھنے کے لئے مستعد رہنا ضروری ہوتا ہے۔

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خدا داد

فوجی امور میں بھی قائداعظمؒ اتنے محتاط تھے کہ مسلح افواج کو اپنی ذاتی قوت کا سرچشمہ بنتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے آخر میں ایسٹ انڈیز کے انگریز کمانڈر انچیف ایڈمرل سر آرتھر پیلیسر نے قائداعظم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ قائداعظمؒ نے کہا ''وہ میرے نیول ایڈوائزر کی حیثیت سے نہیں حکومتِ پاکستان کے نیول ایڈوائزر کی حیثیت میں جب چاہے مجھے مل سکتا ہے۔''

قائداعظمؒ کا ملٹری سیکریٹری ایک کرنل ای جے برنی مقرر ہوا وہ لکھتا ہے کہ وہ ہندوستانی دہشت گردوں کے اندیشے میں قائداعظمؒ کے آس پاس ہمیشہ مسلح رہتا تھا۔ خصوصاً سکھوں نے مشرقی پنجاب میں انتہائی منظم طریقے سے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے تھے۔۔۔ عین ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب قائداعظمؒ ماؤنٹ بیٹن کے ہمراہ گورنمنٹ ہاؤس جا رہے تھے تو کٹر ہندو جماعت آر۔ایس۔ایس نے قائداعظمؒ پر قاتلانہ حملہ کرنے کی کوشش کی تھی کاروں کے جلوس میں سازشیوں کا بم پھٹ نہیں سکا تھا۔ (کولنز) کرنل برنی خود جرأت مند آدمی تھا۔ ۱۹۲۷ء میں ایک دست بہ دست لڑائی میں منڈلہ کے جنگل میں ایک شیر اس کے بازو پر کاٹ کر اور رائفل چھین کر جنگل میں غائب ہو گیا تھا۔ وہ ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کی کوشش کر چکا تھا۔ اس کی جرأت اور ہمت کو لیاقت علی خاں جیسے مردم شناس نے بھانپ لیا تھا اور اس طرح کرنل برنی قائداعظمؒ کا ملٹری سیکریٹری مقرر ہوا۔ اس جیسا جری شخص قائداعظمؒ کے عزم و ہمت کی داد دیتے ہوئے لکھتا ہے ''ایک بار ایسا ہوا کہ ہجوم نے عمارت کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ لوگ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام پر بہت مشتعل تھے۔ قائداعظمؒ بے دھڑک باہر آئے اور مختصراً یہ کہا ''ہم ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ آپ نظم و ضبط برقرار رکھتے ہوئے یہاں سے چلے جائیں۔'' سیدھی سادی دوٹوک بات میں نہ جانے کیا جادو کا اثر تھا کہ وہی مجمع جو چند لمحے پہلے مشتعل

تھا یکا یک ''قائداعظم زندہ باد'' کے نعرے لگاتے ہوئے بڑے اطمینان سے منتشر ہو گیا۔ اپنے عوام پر اتنا زبردست کنٹرول تھا قائداعظمؒ کو! میں سوچتا ہوں کون ہے جو ان کی جگہ لے سکے گا!''

ادھر لاکھوں مہاجر ہندوستان سے پاکستان چلے آرہے تھے۔ قائداعظمؒ کی ہنگامہ خیز زندگی کا آخری برس مہاجرین اور کشمیر کے بارے میں فکرمندانہ گزرا۔ ان کے گرد سازشی ہی نہیں غدار انگریز کمانڈر بھی تھے۔ کشمیریوں کی حفاظت کے لئے قائداعظمؒ نے نیم ساختہ فوج بھیجنا چاہی۔ فیلڈ مارشل سرکلاڈ آکنلیک ایک گھنٹے کے نوٹس پر اڑکر دہلی سے لاہور پہنچا اور تمام برطانوی افسروں کو فوج سے نکال لینے کی دھمکی دی۔ (پاک فوج کے انگریز کمانڈروں نے بھی بھارتی کمانڈروں کے ساتھ ٹیلی فون پر خفیہ ساز باز جاری رکھی۔ کولنز)

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

صاحبو! اس عظیم ہستی کی سوانح حیات کے کچھ واقعات اور سنئے جس نے اپنا سکھ آرام اور چین اپنی قوم کی فلاح کے لئے وقف کر دیا تھا۔ وہ شخص جو بجا طور پر کہتا تھا ''لوگو! تمہارے دلوں کی آواز ہوں میں۔''

برصغیر کے تقریباً سب ہی انگریز افسر ذاتی پر قائداعظمؒ کے مداح ہی نہیں پرستار تھے۔ البتہ ان میں کئی ہندو نوازی اور پاکستان دشمنی کا طور اپنائے رہے۔ مغربی پنجاب کا انگریز گورنر سر فرانسس موڈی قائداعظم کو ۱۹۳۶ء سے قریبی طور پر جانتا تھا۔ موڈی لکھتا ہے ''مجھے تمام زندگی میں کسی شخصیت نے اتنا متاثر نہیں کیا جتنا جناح نے۔ وہ دوستانہ مزاج نہیں رکھتے تھے پھر بھی میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ وہ ایک لاثانی انسان تھے۔ وہ حق پر ہوتے تھے لہٰذا کسی سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے۔''

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

بقول موڈی ''ان کے حق پرست اور ناقابل خرید ہونے کی وجہ سے قائداعظمؒ پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے پرانے رفقائے کار کا بہت خیال رکھتے تھے۔ قائداعظمؒ کو جانچتے وقت ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ان کا مقابلہ کن قوتوں کے ساتھ تھا۔ ایک طرف ہندو دماغ اور ان کی دولت تھی۔ دوسری جانب تقریباً پوری کی پوری برطانوی افسر شاہی یہاں تک کہ وہ ہندوستانی سیاستداں بھی جو نظریۂ پاکستان سمجھ ہی نہیں سکے تھے۔''

سر فرانسس موڈی کے پاس لاہور میں چند ہفتے گزار کر پہلی دسمبر ۱۹۴۷ء کو قائداعظمؒ واپس کراچی پہنچے تو کرنل برنی انہیں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس کی ڈائری کا ایک ورق کہتا ہے کہ ''چند ہفتے پہلے قائداعظمؒ ساٹھ برس کے نظر آتے تھے اور اب وہ اسی سال کے دکھائی دے رہے ہیں'' کشمیر کی فکر نے انہیں تیزی سے بوڑھا کر دیا تھا۔

ملٹری سیکریٹری کرنل برنی نے اس بات کا احساس کرتے ہوئے کہ بے شمار دہشت گرد سرحد پار سے آئے ہوئے ہیں رائے دی کہ گورنمنٹ ہاؤس کے گرد اونچی دیوار

تعمیر کر لی جائے کیونکہ قائداعظمؒ وہیں رہتے تھے۔ قائداعظمؒ بولے ''تمہاری محتاط روی اچھی بات ہے لیکن میں ایسا گورنر جنرل نہیں ہوں جیسے گورنر جنرل تم نے دیکھے ہیں۔ میں عوام سے ہوں۔'' کرنل برنی نے جرح کی ''لیکن کوئی ہندو بھی تو آپ کو شوٹ کر سکتا ہے۔'' قائداعظمؒ نے دل کو چھو لینے والا جواب دیا۔ ''میں فضول خرچی برداشت نہیں کر سکتا۔'' انہیں اپنی ذات کی حفاظت کے لئے کوئی خدمت گار رکھنا پسند نہیں تھا۔

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام
نے غلام اورا نہ اوکس را غلام

آزاد وطن کے حصول کے بعد پہلی بار قائداعظمؒ کی حسِ لطیف کبھی کبھی بیدار نظر آنے لگی۔ وہ گورنمنٹ ہاؤس کے باغ میں کچھ دیر کے لئے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ جاتے اور کچھ دیر کو آنکھیں بند کر کے شاید اپنی کامیابیوں سے محظوظ ہوتے یا پاکستان کے مستقبل کی منصوبہ سازی کرتے۔ باغ میں چہل قدمی کرتے ہوئے وہ گلاب کا پھول توڑ کر اپنے کالر میں لگا لیتے۔ اس وقت کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ گزشتہ ساڑھے تین برس سے ٹی بی جیسے موذی مرض کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ وہ اپنا حال پوچھنے والوں کو یہ کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے۔ ''میں جوان آدمی نہیں ہوں مجھ پر بے شمار ذمہ داریاں ہیں لہٰذا قدرتی بات ہے کہ میں کبھی کبھی تھک جاتا ہوں۔''

صحت میں بھی اور بیماری میں بھی قائداعظمؒ کا مزاج بے لچک رہا۔ صاحبو! ہیکٹر لکھتا ہے کہ ان کی سخت گیری، تنہائی پسندی اور صاف گوئی کے باوجود ان کا بڑے سے بڑا دشمن بھی ان کے کردار پر انگلی نہیں اٹھا سکا۔ ماؤنٹ بیٹن کے اسٹاف کے ایک افسر نے ایک بار قائداعظمؒ کے بارے میں کہا ''وہ نہر سوئز کے مشرق میں سب سے زیادہ سخت مزاج انسان ہیں۔'' قائداعظمؒ کی بیٹی ڈینا واڈیا نے بالکل درست انداز سے اس انگریز کو ٹوکا ''آپ میرے والد کی سخت گیری کی کوئی بھی مثال لے آئیں اور پھر اس کا جائزہ لیں۔ آپ دیکھیں گے کہ پہلے دوسرے شخص نے کوئی خلافِ اصول بات کی ہو گی۔''

نواب بہادر یار جنگ قائداعظمؒ کے بڑے مداحوں میں ہی نہیں تھے بلکہ اپنی قرآنی بصیرت کی بنا پر ان کی قدر و منزلت پہچانتے ہوئے اکثر جلسوں میں کہا کرتے تھے ''مسلمانو! قائداعظمؒ تمہارے لئے اللہ کی نعمت ہیں ان کی قدر کرو۔''

نبی کریمؐ نے فرمایا تھا ''ہم اپنا عہدہ ایسے شخص کو نہیں دیتے جو اس کا طلب گار ہو۔'' قائداعظمؒ جاہ و منصب کی حرص سے کتنے آزاد تھے اس کی ایک مثال دیکھئے۔ آزادی سے بارہ برس پہلے لندن میں برطانوی وزیراعظم رمزی میکڈونلڈ نے جناح سے کہا ''ہم عنقریب ہندوستانیوں کو حقِ خود اختیاری دینے والے ہیں۔ ظاہر ہے مجھے وہاں صوبوں کے گورنرز کی ضرورت ہو گی۔'' جناح نے بلا توقف کہا ''مسٹر میکڈونلڈ! کیا آپ مجھے رشوت دے رہے ہیں؟''

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

ایک دفعہ کا ذکر ہے جناح لندن سے بمبئی کے لئے

پرواز کرنے والے تھے۔ ایک مسلمان عقیدت مند دوڑا بھاگا ایئرپورٹ پہنچا اور کہنے لگا ''میں لندن کے مشرقی کنارے سے ٹیکسی لے کر صرف قائداعظمؒ کی زیارت کرنے آیا ہوں۔'' قائداعظمؒ نے اس شخص سے ہاتھ ملایا لیکن سرزنش کے لہجے میں بولے ''آہ! مسلمان کتنے فضول خرچ لوگ ہیں۔''

ایک چھوٹے شہر کے بڑے جلسے میں کسی نے باآواز بلند نعرہ لگا دیا۔ ''مولانا محمد علی جناح زندہ باد''

قائداعظمؒ نے پرزور الفاظ میں ہجوم سے کہا ''آپ مجھے جناح صاحب یا صرف محمد علی جناح کہہ سکتے ہیں۔'' وہاں موجود لوگ دم بخود رہ گئے۔ اتنا بڑا آدمی القاب و آداب سے بے نیاز ہو چکا تھا!

عہدے اور القاب و آداب سے بے نیازی کی مثالیں آپ نے دیکھیں۔ شہرت سے بے پروائی کے معاملے میں صحافیوں سے ان کے طرز عمل کا کچھ بیان بھی ہو چکا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بے حد وجیہہ اور کامیاب انسان ہونے کے باوجود قائداعظمؒ کی زندگی میں کسی اسکینڈل نے سر نہیں اٹھایا۔ ان کی بیوی رتی جناح کے سوا کوئی اور خاتون قائداعظمؒ کے دل میں جگہ نہیں بنا سکی۔ ہندوستان کے آخری سے پہلے وائسرائے کی بیگم لیڈی ویول نے کہا ''میں نے تمام زندگی میں مسٹر جناح جیسا خوبرو آدمی نہیں دیکھا! ان کے نقوش مغربی تھے لیکن انتہائی پروقار مشرقی چال ڈھال کے ساتھ۔'' سروجنی نائیڈو کے تاثرات آپ پڑھ ہی چکے ہیں اور بیگم رعنا لیاقت علی خان کہتی ہیں ''کتنی ہی خواتین تھیں جناح جن کے دلوں میں بستے تھے۔''

قائداعظمؒ ایک ایسے تیز گام مسافر تھے جو اپنی منزل کی لگن میں سیدھا منہ کئے چلا جا رہا ہو۔ وہ نہ جذبات کی جھاڑیوں یا گل بوٹوں میں الجھتے یا رکتے تھے اور نہ پیچھے مڑ کر دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ کراچی میں اس مکان کو دیکھنے بھی نہیں گئے جہاں وہ ۷۱ برس پہلے پیدا ہوئے تھے!

مارچ ۱۹۴۸ء میں بھی وہ روزانہ پوری تندہی سے اپنی ڈیسک پر کام کرتے رہتے تھے۔ انہیں آرام کی فرصت کم ہی ملتی تھی کیونکہ وہ سات کروڑ پاکستانیوں کے ذمہ دار لیڈر تھے۔ ابھی پانچ برس پہلے پنڈت نہرو نے بڑی لاپروائی سے کہا تھا کہ ''پاکستان تو ایک دیوانے کا خواب ہے۔ چند مٹھی بھر لوگوں کو چھوڑ کر ہندو اور مسلم میں کوئی فرق نہیں ہے!'' اور آج قائداعظم بھی زندہ باد تھے اور پاکستان بھی زندہ باد!

مارچ ۱۹۴۸ء میں قائداعظمؒ مشرقی پاکستان گئے اور ڈھاکہ میں طلباء سے بہت شفقت آمیز لہجے میں خطاب کرتے ہوئے کہا ''میں نے برسوں بڑی محبت سے آپ کی خدمت کی ہے۔ میری ایک بات یاد رکھئے۔ اگر آپ کسی سیاسی پارٹی کا آلۂ کار بن گئے تو یہ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہوگی۔''

قائداعظمؒ دن بدن کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ۱۵ اپریل سے ایک ہفتے تک صوبہ سرحد کا طوفانی دورہ کیا۔ مئی میں آب و ہوا کی تبدیلی کی غرض سے کوئٹہ سے ۷۰ میل دور زیارت تشریف لے گئے۔ پھولوں پھلوں کے باغات اور پہاڑیوں کے درمیان گھرا ہوا ایک خوبصورت بنگلہ وہاں ان کا مسکن تھا۔ ان کے اسٹاف کو امید تھی

کہ قائداعظم زیارت میں کچھ آرام کریں گے لیکن آرام قائداعظمؒ کی فطرت میں نہیں تھا۔ کراچی سے روزانہ سیاہ رنگ کے خوبصورت ڈبے آتے تھے۔ ان ڈبوں پر چمکدار سنہرے حروف میں ایم اے جے لکھا ہوتا تھا۔ ایم اے جے یعنی محمد علی جناح۔ جنہیں قوم نے محبت سے کہا ''قائداعظمؒ''۔

اللہ کی دین ہے جسے دے
میراث نہیں بلند نامی

قائداعظمؒ یوں تو اب گورنر جنرل پاکستان اور کروڑوں مسلمانوں کے بے تاج بادشاہ تھے لیکن حق یہ ہے کہ ان کی حکومت دلوں پر تھی۔ وہ علامہ اقبالؒ کے شاہین اور خوددار مردِ مومن تھے۔ ان کی گردن صرف حضورِ حق میں جھکتی تھی۔ مولانا حسرت موہانی جیسا درویش یہ کہہ گزرا کہ ماؤنٹ پلیزینٹ بمبئی میں ایک بار اتفاقاً انہوں نے جناح کو نماز میں ایسا سجدہ کرتے دیکھا جس کی نظیر انہیں کہیں نہیں ملی!

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

قائداعظمؒ کے نئے نیول اے۔ ڈی۔ سی لیفٹیننٹ مظہر احمد بڑی عقیدت سے یادیں تازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ''قائداعظمؒ کی شخصی عظمت ایسی تھی کہ ان کے سامنے ہر فرد کی طرح میں بھی مرعوب سا رہتا تھا لیکن کبھی کبھی وہ بڑی دلچسپ باتیں بھی کرتے اور اپنی شاندار زندگی کی مزے مزے کی آپ بیتیاں بھی سناتے لیکن ان کہانیوں میں ہمیشہ ہمارے لئے کوئی نہ کوئی سبق ہوتا تھا۔ کہانی شروع کرتے وقت وہ اپنے مخصوص انداز میں اپنی انگلی ہوا میں لہراتے ''لو میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں''..... یہ سنتے ہی ہم سب ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ مثال کے طور پر قائداعظمؒ کی بتائی ہوئی ایک کہانی یہ ہے کہ ایک بار قائداعظمؒ شملہ کی پہاڑیوں میں ٹہل رہے تھے۔ ان کی جیب میں کچھ مونگ پھلیاں تھیں۔ درختوں پر کچھ بندر نظر آئے۔ انہوں نے کچھ مونگ پھلیاں بندروں کی طرف اچھال دیں۔ قائداعظمؒ نے حیرت سے مشاہدہ کیا کہ ایک بھی بندر اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ اتنے میں ایک بڑا بندر دھیرے دھیرے درخت سے اترا۔ یہ دیکھتے ہی سب بندر گویا ادب سے خاموش ہو گئے۔ جب تک اس لیڈر بندر نے مونگ پھلی نہ اٹھا لی دوسرے بندر آگے نہیں بڑھے۔ ازراہِ نصیحت پھر قائداعظمؒ نے کہا ''دیکھا آپ نے! کہ بندروں میں بھی ڈسپلن ہوتا ہے۔''

قائداعظمؒ کا ڈسپلن ان کی اپنی ذات پر بھی لاگو ہوتا تھا۔ گورنر جنرل پاکستان کے لئے اونی سوئٹر لایا گیا۔ وہ پہلی ہی دھلائی میں سکڑ گیا۔ قائداعظمؒ نے لیفٹیننٹ مظہر سے کہا کہ وہ دکاندار کے پاس جا کر اسے یہ بات بتا دیں۔ ''اچھے لڑکے! تمہیں پیسے کی قدر سیکھنی چاہئے۔''

اس دوران کراچی میں گورنر جنرل ہاؤس کے قریب ہی ایک آزاد اور کامیاب پاکستان کا جیتا جاگتا محسوس ثبوت اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی پرشکوہ عمارت کی شکل میں تعمیر ہو گیا۔ خرابی صحت کے باوجود قائداعظمؒ کوئٹہ سے کراچی آئے تاکہ اسٹیٹ بینک کا افتتاح کر سکیں۔ پہلی جولائی ۱۹۴۸ء کو قائداعظمؒ نے رسم افتتاح کے موقع پر جو دلنشیں تقریر کی اس کا گراموفون ریکارڈ آج بھی ریڈیو پاکستان کراچی

میں موجود ہے۔ اس وجد آفریں خطاب میں قائداعظمؒ کی دوراندیشی اور فکر کی گہرائی ملاحظہ کیجئے۔

''مغرب کا معاشی نظام بنی نوع انسان کے لئے لاینحل مسائل لے کر آیا ہے۔ اس نظام نے بین الاقوامی سطح پر نااتفاقی کو فروغ دیا ہے اور انسان کو انسان سے انصاف کا برتاؤ کرنے کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ مغرب کے اس غیر منصفانہ اقتصادی نظام کی وجہ سے دو عظیم جنگیں ہو چکی ہیں۔ مغرب اپنی تمام تر مشینی اور سائنسی ترقی کے باوجود آج ہمیشہ سے زیادہ الجھنوں کا شکار ہے۔ مغرب کا معاشی نظام ہمیں آسودہ حال نہیں بنا سکے گا۔ ہم اہلِ پاکستان کو اپنی راہ خود چننی ہو گی اور اپنی تقدیر خود بنانی ہو گی۔ ہمارے پاس مساواتِ انسانی اور سما[illegible]اف کے درخشاں اسلامی اصول موجود ہیں۔ بحیثیت م[illegible]ن ہم اپنے مشن کو اس طرح پورا کر سکتے ہیں کہ بنی نوع انسان کو ان مقدس اصولوں کے ذریعے امن کا عملی پیغام دیں۔'' غور فرمایئے کہ اس خطاب میں قائداعظمؒ اہل مغرب سے صاف کہہ گئے ہیں۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

اور صاحبو! یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ قائداعظمؒ صاف طور سے پاکستان کو منزل نہیں منزل کی طرف جانے والا ایک قدم سمجھتے تھے۔ ان کی منزل یہ تھی کہ پاکستان میں اسلامی اصولوں کے تحت ایک ایسا معاشرہ تشکیل کر دیا جائے جو دنیا بھر کی قوموں کے لئے ایک خوبصورت نمونہ ہو۔

اسٹیٹ بینک کے افتتاح کے ساتھ قائداعظمؒ اور پاکستان کے ان ناقدوں کی زبانیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں جو اس نئی مملکت کو معاشی طور پر ناقابل سمجھتے تھے۔ قائداعظمؒ کا نیا ملٹری سیکریٹری نولز لکھتا ہے کہ اسٹیٹ بینک کی تقریب سے قائداعظمؒ جب گورنمنٹ ہاؤس واپس پہنچے تو ان کے قدم تھکاوٹ سے لرزاں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آج ان کا مشن تکمیل کو پہنچا ہے۔ اور فی الواقع ایسا ہی ہوا۔ یہ آخری سرکاری فریضہ تھا جو انہوں نے نبھایا۔

کراچی سے جب زیارت واپس پہنچے تو چھ فٹ کے محمد علی جناح کا وزن صرف ۷۰ پونڈ رہ گیا تھا۔ جاننے والے بخوبی جانتے تھے کہ ہر چند ان کی چال ڈھال میں وہی تمکنت تھی اور ان کی آنکھوں کے چراغ ہمیشہ کی طرح روشن تھے لیکن قائداعظمؒ کا جسم نہیں ان کی قوت ارادی ان کو زندہ رکھے ہوئے تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ موت سے بھی شکست کھانا نہیں چاہتے بلکہ ان کی قوت ارادی فیصلہ کرنا چاہتی ہے کہ انہیں کب مرنا چاہئے۔ وہ علاج اور طبی دیکھ بھال پر راضی نہیں ہوتے تھے۔ مس فاطمہ جناح نے بمشکل انہیں منایا اور ۲۴ جولائی ۱۹۴۸ء کو گائز ہاسپٹل لندن کے گریجویٹ ڈاکٹر لیفٹیننٹ کرنل الٰہی بخش نے ان کا معائنہ کیا۔ قائداعظمؒ نے انہیں ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''میں چالیس برس سے روزانہ ۱۴ گھنٹے کام کرتا آیا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ بیماری کیا ہوتی ہے۔''

ڈاکٹر الٰہی بخش اور دیگر ڈاکٹروں کے تفصیلی معائنے کے بعد قائداعظم کو جب ان کی مہلک بیماری سے آگاہ کیا گیا تو وہ لمحہ بھر کو بھی پریشان نہیں ہوئے۔ کہا تو صرف یہ کہ

''آپ نے مس جناح کو تو نہیں بتایا؟'' جواب اثبات میں ملا تو بولے ''آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا بالآخر وہ ایک عورت ہے۔ خیر! کوئی بات نہیں جو ہو چکا وہ ہو چکا۔''

"WHAT IS DONE IS DONE"

قائداعظمؒ کی عظمتِ کردار کی تمام جھلکیاں ان کی زندگی کے آخری ایام میں دیکھی جا سکتی تھیں۔ ایک بار لیڈی کمپاؤنڈر نے قائداعظمؒ کو ان کا ٹمپریچر بتانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ پہلے ڈاکٹر کی اجازت چاہئے۔ لیڈی کمپاؤنڈر کا یہ ''آئینی طریقۂ کار'' دیکھ کر قائداعظمؒ بہت مسرور ہوئے۔

ڈاکٹر الٰہی بخش نے زیارت کی سردی کے پیش نظر قائداعظمؒ کے لئے کراچی سے اونی کپڑوں کا آرڈر بھیجا۔ وہ شخص جو کبھی برصغیر کا سب سے خوش لباس انسان تھا گورنر جنرل بننے کے بعد اپنی ذات پر خرچ کرتے ہوئے سو بار سوچنے لگا تھا۔ قائداعظمؒ نے کہا ''ڈاکٹر! میری بات یاد رکھو پیسہ خرچ کرنے سے پہلے یہ سوچ لیا کرو کہ اس چیز کے بغیر کام چل سکتا ہے یا نہیں؟''

شدید بیماری کی حالت میں بھی قائداعظمؒ کو احساس تھا کہ قوم کی نگاہیں ان پر لگی ہوئی ہیں لہٰذا وہ اپنے مرض کی خبر عوام تک پہنچتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کی موجودگی انہیں بیماری کا احساس دلاتی تھی لہٰذا وہ بلا تکلف کہہ دیا کرتے تھے۔ ''جائیے' مجھے تنہا چھوڑ دیجئے۔'' ایک بار انگریز نرس سسٹر ڈنہم نے ایک دوا کے لئے اصرار کرتے ہوئے کہا ''سر! یہ ڈاکٹر کا آرڈر ہے۔'' قائداعظمؒ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ''دیکھو! میں آرڈر لیتا نہیں ہوں' آرڈر دیتا ہوں۔'' نرس نے بات بناتے ہوئے کہا ''کوئی بات نہیں آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے کے طور طریقے سمجھ لیں گے۔'' جواب آیا ''میرے طور طریقے سوائے کامن سنس کے اور کیا ہیں؟''

زیارت سے کوئٹہ آنے کا پروگرام بنا تو قائداعظمؒ نے اسٹریچر پر بھی گھریلو لباس پہننا گوارا نہ کیا۔ نفیس لباس اور جوتے زیب تن کر کے اور وہی اپنا روایتی مونوکل عدسہ گرے ریشمی ڈوری کے ساتھ' اپنی پچاس سالہ پرانی سج دھج کے ساتھ کوئٹہ پہنچے۔ ان کی آرزو تھی کہ پورے عزم و ہمت کے ساتھ چلتے پھرتے کراچی پہنچیں۔ ۲۹ اگست کو انہوں نے ڈاکٹر الٰہی بخش سے کہا ''جانتے ہو جب میں زیارت آیا تھا تو جینے کا آرزومند تھا لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ جیوؤں یا نہ جیوؤں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' خیالات کی اس تبدیلی کا سبب انہوں نے یہ بتایا ''میں اپنا کام مکمل کر چکا ہوں۔''

۵ ستمبر کو انہیں نمونیہ ہو گیا تیز بخار کی بے چینی میں وہ بار بار یہ کہہ رہے تھے ''کشمیر کمیشن کہاں گیا؟ کہاں ہیں وہ لوگ؟ انہیں آج مجھ سے ملنا تھا۔''

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

قائداعظمؒ کی صحت اور زندگی کچھ اور وفا کر جاتی تو وہ یقیناً اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر کئے گئے اپنے خطاب کے مطابق ملک میں اسلامی بلکہ قرآنی آئین حکومت نافذ کر جاتے۔ انڈونیشیا' عرب ممالک اور دیگر مشرقی و مغربی ریاستوں کے ساتھ انہوں نے خیر سگالی کے جو جذبات

پیدا کئے تھے وہ یقیناً آزادیٔ کشمیر اور پاکستان کی ترقی کی راہ میں بہت کارگر ثابت ہوتے۔ بیماری کی حالت میں قائداعظمؒ کو بخوبی احساس تھا کہ قوم خدا کے بعد ان پر انحصار کرتی ہے لہٰذا وہ کہتے تھے کہ میں اپنی صحت کے بارے میں قوم کو بذات خود مناسب موقع پر مطلع کروں گا۔

ہائے وہ میر کارواں نہ رہا

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء..... قائداعظمؒ کوئٹہ سے کراچی واپس تشریف لا رہے ہیں۔ تین جہازوں کا عملہ اور دیگر لوگ اسٹریچر پر لیٹے ہوئے قائداعظمؒ کو الوداعی سلام اور سیلوٹ کرتے ہیں۔ شدتِ مرض اور نقاہت میں بھی ان کے پروقار آداب سلامت ہیں۔ قائداعظمؒ آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ پیشانی تک لے جا کر جوابی سیلوٹ کرتے ہیں۔ سہ پہر سوا چار بجے گورنر جنرل کا خوبصورت وائی کنگ طیارہ ماری پور کے ہوائی اڈے پر اتر جاتا ہے۔ یہ سفر خفیہ رکھا گیا ہے۔ جہاں جہاز اترا ہے وہاں قریب ہی ایک فوجی ایمبولینس تیار کھڑی ہے جسے گورنمنٹ ہاؤس پہنچنا ہے۔ مس فاطمہ جناح اور سسٹر ڈنہم اس ایمبولینس میں شریکِ سفر ہیں۔

صاحبو! دورانِ سفر یہ سانحہ پیش آیا کہ شہر کے باہر ایک گنجان آباد مہاجر کیمپ سے گزرتے ہی ایمبولینس خراب ہو گئی۔ ڈرائیور ایک گھنٹے سے زیادہ انجن سے الجھتا رہا۔ یہاں تک کہ کراچی سے ایک اور ایمبولینس لائی گئی۔ سسٹر ڈنہم کہتی ہیں کہ وہ اس ایک گھنٹے سے زائد جاں گسل انتظار کے دوران میں قائداعظمؒ کو گتے کے ایک ٹکڑے سے پنکھا جھلتی رہی۔ انہوں نے انتہائی شفقت سے مجھے دیکھا وہ بول نہیں پائے لیکن ان کا جذبۂ تشکر ان کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ میری خدمات کا اس سے بڑا انعام اور کیا ہو سکتا تھا۔

شام ۶ بج کر ۱۰ منٹ پر ایمبولینس گورنمنٹ ہاؤس پہنچی۔ وہاں انہیں جو دوا دی گئی اسے وہ نگل نہ سکے۔ ۹ بج کر ۵۰ منٹ پر ڈاکٹر الٰہی بخش نے قائداعظمؒ سے کہا ''سر! ہم نے آپ کو انجکشن دے دیا ہے۔ انشاء اللہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔'' قائداعظمؒ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے مخصوص پراعتماد انداز میں کہا ''نہیں''۔

"I WILL NOT!"

صاحبو! زندگی بھر اپنے قول کا پکا رہنے والا انسان اپنے آخری قول میں بھی سچا نکلا۔ آدھے گھنٹے بعد ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اس عظیم ہستی کا انتقال ہو گیا جسے خداوندِ ذوالجلال نے ایک عظیم مشن کے لئے منتخب کیا تھا۔

راتوں رات یہ خبر ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ ہیکٹر لکھتا ہے کہ وہ رات بڑی ہی گرم و مرطوب اور بھاری رات تھی لیکن اس اندھیری رات میں ہی سفید کپڑوں میں ملبوس لوگوں کا ایک سمندر تھا جو گورنمنٹ ہاؤس کے گرد جمع ہو گیا تھا۔ لوگوں کے جذبات کا یہ عالم تھا کہ وہ دیوانہ وار گورنمنٹ ہاؤس کی چار دیواری کو چھو کر ہچکیاں لیتے ہوئے اپنے محسن اور نجات دہندہ کے لئے دعائیں کر رہے تھے۔

اگلے روز قائداعظمؒ کو شہر کراچی کے دل میں پورے اعزاز و احترام کے ساتھ سپردِ خاک کر دیا گیا۔ وہ خاک جہاں سے وہ ۵۹ برس پہلے نان جی جعفر سے یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے

''خاک سے اٹھ کھڑے ہو تا کہ ہمارے کپڑے میلے نہ ہوں اور ہمارے ہاتھ بڑے کام کرنے کے لئے صاف رہیں۔''

صاحبو! ہیکٹر بولیتھو کی کتاب ''جناح! پاکستان کے خالق'' کا تعارف اور ہمارا اس کتاب سے استفادہ یہاں تکمیل کو پہنچتا ہے۔ عزم و ہمت، حوصلے اور ولولے، یقین محکم، عمل پیہم اور عظمت کردار کی ایسی شاندار داستان حیات سے کونسا غیر متعصب ذہن اور دل بینا ہے جو متاثر نہ ہو۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اپنی کتاب کے شروع میں ہی ہیکٹر نے صاف لکھ دیا ہے کہ اس نے پوری کوشش کی ہے کہ اس کی تحریر حقائق پر مبنی ہو اور مصنف کے جذبات کا اس کی تحریر میں دخل نہ ہو۔

اب صاحبِ ''دستک'' بڑے اعتماد سے عرض کرتا ہے کہ آپ دنیا کے کسی بھی سیاسی لیڈر کی داستان حیات پڑھ جائیے، اپنی منزل کے حصول کے لئے قائداعظمؒ جیسی بلند کرداری، عزم و ارادہ، مسلسل محنت، خود اعتمادی اور یکسوئی کی مثال نہیں ملے گی۔

قائداعظمؒ مسلمانان برصغیر کے کتنے بڑے محسن تھے اس کا اندازہ وہ نسل زیادہ کر سکتی ہے جنہوں نے متحدہ ہندوستان میں ہندوؤں کی برتری دیکھی ہے۔ قائداعظمؒ نے ایک موقع پر بجا فرمایا تھا۔ ''ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مشترک چیز صرف ایک ہے اور وہ ہے برطانیہ کی غلامی۔'' غیر منقسم ہندوستان میں تاجر، ساہوکار، پروفیشنلز، منتظم ہندو ہوتے تھے، بڑے بزنس انشورنس، بینکنگ وغیرہ پر پارسی چھائے ہوئے تھے۔ مزدور اور چھوٹے کاریگر مسلمان ہوتے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ ان کے محلے یہاں تک کہ پانی کے کنوئیں بھی علیحدہ ہوتے تھے۔ ہندو سماج چار بڑی ذاتوں اور پانچ ہزار چھوٹی ذاتوں میں بٹا ہوا تھا۔ مسلمان ذات پات کی اس اونچ نیچ میں کہیں بھی فٹ نہیں ہوتے تھے۔ کالنز اس بیان کے علاوہ لکھتا ہے کہ ۲۸ جنوری ۱۹۳۳ء کو چودھری رحمت علی مرحوم نے لندن میں قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی موجودگی میں بجا طور پر اس عزم کا اظہار کیا تھا۔

''ہم ہندو قومیت کی سولی پر ہرگز نہیں چڑھیں گے۔''

بقول امریکی مصنف کالنز بیسویں صدی کے پہلے نصف کے زیادہ تر حصے میں ہندوؤں کی قیادت گاندھی جیسے شخص کے ہاتھ میں تھی جس کے بارے میں برطانوی وائسرائے لارڈ ویول نے کہا تھا ''گاندھی ایک چالاک، ضدی، اور دو زبانوں والا آدمی ہے جس میں سادھو پن اور درویشی نام کو نہیں۔''

مشہور کتاب ''فریڈم ایٹ مڈنائٹ'' کا مسلم دشمن، ہندو نواز اور بھارت نواز امریکی مصنف ''کالنز'' اپنی کتاب میں صاف طور سے اقرار کرنے پر مجبور نظر آتا ہے۔ ''ہندوستان کے مستقبل کی کلید کسی اور کے نہیں جناح کے ہاتھ میں تھی۔ گاندھی تو ایک ناکام وکیل تھا اور عورتوں کی موجودگی میں آشرم میں برہنہ غسل کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ کپڑے تو محض حیا کا دھوکہ دیتے ہیں۔ گاندھی نے دھوتی پہن کر اپنی سیاست کی دکان جذبات پر چمکائی۔ وہ کہتا رہا کہ ہم پاکستان

کے نام پر ایک انچ نہیں دیں گے۔ اس کا بڑا بیٹا شرابی تھا اور تین چھوٹے بیٹے لارڈ ویول کی طرح گاندھی کو پہچانتے ہوئے اس سے لاتعلق رہتے تھے۔ نہرو نظریۂ پاکستان کو دیوانے کی بڑ سمجھتا تھا اور پٹیل دعویٰ کرتا تھا کہ ۱۹۵۲ء سے پہلے پاکستان خود بھارت سے آملے گا۔ ہندو لیڈروں نے پوری کوشش کی کہ پاکستان کے حصے کا ۲۰ فیصد خزانہ اور سامان وہاں پہنچنے نہ پائے یہاں تک کہ ۵۵ کروڑ روپے آخر دم تک روک کر رکھے۔'' بقول کولنز اپریل ۱۹۴۷ء میں بمبئی کے پارسی ڈاکٹر جل پٹیل کی الماری میں جناح کی جو ایکسرے رپورٹ رکھی تھی وہ اس دور کے ہندوستان کا سب سے بڑا راز تھا۔ اگر یہ راز کھل جاتا تو ہندو لیڈر مطالبۂ پاکستان کو ایک دو برس قائداعظمؒ کی وفات تک موخر کر دیتے۔ اس طرح پاکستان شاید کبھی قائم نہ ہوتا۔

صاحبو! یہاں سوچنے کا مقام یہ ہے کہ سات کروڑ مسلمانوں کا مستقبل فردِ واحد سے اس حد تک وابستہ کیسے ہو گیا؟ یہ سوال بذات خود قائداعظمؒ محمد علی جناح کی عظمت کی دلیل ہے۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں قائداعظمؒ سے ملنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے کہا ''جب تک میں جناح سے مل نہیں لیا مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہندوستان میں میرا کام کتنا مشکل ہے! وہ عزم و ہمت کے ایسے کوہِ گراں تھے جنہیں کوئی ہلا نہیں سکتا تھا۔''

کالنز انتہائی حیرت سے یہ راز بھی فاش کرتا ہے کہ تقسیم ہند کے موقع پر پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں پر حالات کا دباؤ اور مسائل کا انبار اتنا زیادہ تھا کہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں جواہر لعل نہرو نے گھبرا کر ماؤنٹ بیٹن سے یہ درخواست کی کہ حالات معمول پر آنے تک ماؤنٹ بیٹن حکومت ہند کا سارا کاروبار خفیہ طور پر سنبھال لے۔ نہرو کا کہنا تھا کہ ہندو قیادت کو تحریکیں چلانے کا تجربہ تو ہے اضطراری حالات میں حکومت چلانے کا کوئی تجربہ نہیں۔

صاحبو! کانگریس کی پوری لیڈر شپ، آئی سی ایس کے ایک ہزار افسر اور کئی لاکھ ہندوستانی فوجی انگریزوں سے آزادی حاصل کر کے کھڑے ہونے لگے تو ان کے قدم لڑکھڑا گئے۔ تاریخ کا عجب مذاق ہے کہ اس انگریز نے حکومت ہند کو سہارا دیا جس کے لیڈروں نے انگریز کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی تھی! ماؤنٹ بیٹن نے کئی ماہ تک حکومت ہند کا کاروبار چلایا۔ سرحد کے اس پار پاکستان میں قائداعظمؒ محمد علی جناح کے ضعیف و نحیف جسم میں کچھ ایسی کرشماتی توانائی تھی کہ بے سروسامان پاکستانیوں کو کسی غیر کے سہاروں کی ضرورت نہ تھی۔ جس طرح کراچی کے باہر چند لوگوں نے ۱۹۴۷ء میں ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگاتے ہوئے اتری ہوئی ٹرین کو دوبارہ پٹری پر ڈال دیا تھا اسی طرح آزاد و خود مختار پاکستان ''قائداعظم زندہ باد'' کے نعرے لگاتا ہوا تاریخ کے سفر پر رواں دواں ہو گیا۔

''فبای الاء ربکما تکذبن''

اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ثریا کوثر قیصرانی

تنقید

بھلائی اور برائی دونوں یکساں نہیں ہیں۔تم برائی کو اس چیز سے دفع کرو جو زیادہ بہتر ہے تو تم دیکھو گے کہ وہی جس کے اور تمہارے درمیان عداوت ہے، گویا وہ ایک سرگرم دوست بن گئے ہیں۔اور یہ دانش نہیں ملتی مگر انہی کو جو ثابت قدم رہنے والے ہیں اور یہ حکمت نہیں عطا ہوتی مگر انہی کو جو بڑے نصیبہ ور ہیں۔(حٰمٓ السجدہ ۴۱، آیت نمبر ۳۴۔۳۵)

''میں کتنی بار آپ سے کہہ چکا ہوں۔۔۔''، ''میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا۔۔۔''، ''یقین نہیں آتا کہ تم ایسا کرو گے''۔''ہائے ہائے! تم ایسا کیوں سوچنے لگ گئے ہو''، ''تم تو ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہو''، ''آپ کبھی بھی یہ نہیں کرتے''، ''احمق نہ بنو''، ''پاگل ہو گئے ہو کیا؟''، ''میں پہلے ہی جانتا تھا کہ ایسے ہی ہوگا''، ''تم میری بات پر توجہ کیوں نہیں دیتے''، ''دل پہ کیوں لے بیٹھے ہو''، ''مجھے لگتا ہے کہ تم موٹے ہوتے جا رہے ہو''، ''اپنی صحت اور خوراک کا خیال رکھا کرو پیلی مکڑی ہوتی جا رہی ہو''۔ ''پہلے تو تم ایسے نہ تھے''۔۔۔۔

تنقید، تنقید اور تنقید۔ تنقید بظاہر تو پانچ حروف کا ایک لفظ ہے لیکن اس نے ہم میں سے اکثر کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ تنقید کسی بھی شکل میں کی جا سکتی ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا فہرست میں سے کوئی فقرہ ہو سکتا ہے، کوئی طنزیہ سوال پوچھا جا سکتا ہے حتیٰ کہ ٹھنڈی آہ بھرنے یا صرف اونچی آواز اور لمبی لے میں اللہ کا لفظ ادا کر کے تنقید کے تقاضے پورے کر لئے جاتے ہیں۔تنقید ایسی چیز ہے کہ جسے شاید کوئی بھی پسند نہیں کرتا لیکن کوئی شخص اس سے بچ بھی نہیں سکتا۔اس ضمن میں یہ امر اور بھی دلچسپ ہے کہ اکثر لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں مگر تنقید کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے۔تنقید برداشت کرنا خاصا ہمت طلب مسئلہ ہے لیکن دوسرے پر تنقید کرنا اتنا فطری اور آسان لگتا ہے کہ جیسے سانس لینا۔

ذرا ایک لمحہ کے لئے سوچئے کہ آپ پر بچپن میں کس قسم کی تنقید کی جاتی تھی۔دوسرے لفظوں میں آپ کی ''چھیڑ'' کیا تھی؟ آپ کو اپنے اساتذہ، والدین، دوستوں، بہن بھائیوں اور رشتہ داروں سے کیا کیا ''سننا'' پڑتا تھا۔میں آپ کو اپنی مثال دیتی ہوں۔

مجھے گونگی کہا جاتا تھا کیونکہ میں دیر سے بولنا شروع ہوئی یا پھر کم گوئی کی عادت اس طعنہ کی وجہ بنی ہوگی۔ سکول جانا شروع کیا تو آس پاس بیٹھے بچوں بچیوں کے متعلق مختلف فقرے سننے کو ملتے۔شاہدہ جیسی بدخطی آج تک نہیں دیکھی۔اکرم کی اتنی بڑی ناک ہے مگر شرم لحاظ نام کو نہیں۔شکل اچھی نہیں تو بات اچھی کیا کرو۔ تم کبھی نہیں سدھر سکتے۔وغیرہ وغیرہ۔

یہ وہ چند تنقیدی جملے ہیں جو میں نے اپنے بچپن میں عام سنے۔ آپ کو شاید اس سے بھی زیادہ کا تجربہ یا مشاہدہ ہوا ہو۔

گذشتہ ایک ماہ میں آپ نے اپنے اوپر کون سی تنقید سنی؟ آپ کو یقیناً کئی مواقع یاد آ گئے ہوں گے۔ اب ذرا ایک منٹ غور کیجئے کہ آپ نے اپنے بچپن میں کتنے اور کون کون سے بچوں پر تنقید کی تھی۔ کچھ یاد آیا؟ تجربہ بتاتا ہے کہ جو تنقید یا طنزیہ جملے ہم نے اپنے متعلق سنے انہیں یاد کرنا بڑا آسان ہے بہ نسبت اس کے جو تنقید ہم نے دوسروں پر کی تھی۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

اس کی وجہ ماہرینِ نفسیات یہ بتاتے ہیں کہ تنقید آپ کے اندازے سے کہیں زیادہ تکلیف پہنچاتی ہے۔ اس کے اثرات اتنے شدید اور گہرے ہوتے ہیں کہ انہیں ذہن سے نکالنا بے حد مشکل ہے باوجودیکہ آپ سالہا سال سے اس پر سوچنا چھوڑ چکے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ تنقید سننا اتنا تکلیف دہ اور کرب انگیز عمل ہے کہ انسان اس سے بچنے کے لئے سب کچھ کر گزرتا ہے۔ صرف تنقید سے گھبرا کر کئی نوجوان ایسی سرگرمیوں پر اپنا وقت اور توانائیاں صرف کر دیتے ہیں کہ جو اُن کا مطمع نظر نہیں ہوتیں۔ شہروں میں حالاتِ زندگی ذرا مختلف ہیں لیکن دیہاتوں میں ہر شخص دوسروں کے معاملات میں دخل دراندازی اپنا اولین فرض سمجھتا ہے۔ وہاں کئی نوجوان میٹرک میں فیل ہونے یا اچھے نمبر حاصل نہ کر سکنے کی وجہ سے صرف تعلیم ہی نہیں گھر بار تک چھوڑ جاتے ہیں۔ تنقید کے نشتروں کے ڈر سے حساس بچے خودکشی کر لیتے ہیں۔ آپ یقیناً ایسی کئی عورتوں یا خاندانوں سے واقف ہوں گے جو جہنم کی زندگی بسر کرتے رہیں گے لیکن لوگوں کی تنقید کے ڈر سے علیحدہ نہیں ہوں گے۔

ضرب المثل مشہور ہے کہ ایشاء میں عملاً دو خداؤں کی اجارہ داری ہے۔ ایک خدائے حقیقی اور دوسرا خدا ''لوگ کیا کہیں گے؟'' ہے کہ جس سے ہر ایک ڈرتا ہے۔ تنقید کی تباہ کاریاں اتنی شدید ہیں کہ بہت سارے لوگ صرف اس ڈر سے مثبت کام شروع نہیں کرتے۔ ایک خاتون صرف اس وجہ سے صبح کی سیر شروع نہیں کرتی کہ وہ ڈرتی ہے کہ اگر کسی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا تو اس کے بھائی، بہنیں اور دوست مذاق اڑائیں گے اور کہیں گے ''ہمیں پہلے ہی پتہ تھا کہ یہ کہاں اور صبح کی سیر کہاں''۔ ''یہ منہ اور مسور کی دال''۔ ''ان تِلوں میں تیل نہیں''۔ کئی باصلاحیت اور محنتی لوگوں کے منصوبوں پر آپ نے یہ ریمارکس سنے ہوں گے۔ ''یہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا''۔ ''بے وقوف جو ہوا''۔ ''مجھے تو یہ خبطی لگتی ہے''۔

ہم ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں تو یہ کتنے دکھ کی بات ہے۔ اگر ہم تنقید کی روش ترک کر کے حوصلہ افزائی کا رویہ اختیار کریں تو بہت سے لوگوں کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ کتنے نئے خیالات، ایجادات اور افکار جنم لے سکتے ہیں اگر تنقید کے ڈر سے انسانیت کو آزادی مل جائے۔ بلاشبہ تنقید کا خوف یا تنقید بذاتِ خود ہماری ذاتی اور کاروباری زندگی کی کامیابی میں اہم ترین رکاوٹ ہے۔ یہ وہ سپیڈ بریکر ہے کہ جو معاشرے کی گاڑی کو ہموار چلنے سے روکتا ہے۔

پس چہ باید کرد

اگر واقعی یہ اس قدر صلاحیت کش ہے تو پھر کیا کیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ Change

آئے اور معاشرہ میں مثبت تبدیلی ہو تو سب سے آسان کام اپنے آپ کو تبدیل کرنا ہوا کرتا ہے۔

اِس تبدیلی کے عمل میں ہمارا کردار دو طرح کا بنتا ہے۔

(۱) ہم غور کریں کہ ہمارا رویہ کیسا ہے؟ کہیں ہم بھی تنقید کرنے کے 'گناہِ کبیرہ' میں دانستہ یا نادانستہ ملوث تو نہیں۔ اگر ایسا ہے تو اپنے رویے میں تبدیلی لانا چاہئے۔

(یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ مثبت تنقید (Feed Back) اور Criticism میں لطیف مگر نہایت ہی اہم فرق ہے۔ Feed Back کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کے آداب کو ملحوظ خاطر رکھنا بڑا اہم ہے۔ ان تقاضوں پر بحث کا یہ موقع نہیں ہے)۔

(۲) ہم تنقید کے منفی اور صلاحیت کُش اثرات سے اپنے آپ کو کیسے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ مذکورہ تمہید درحقیقت اسی مقصد کو واضح کرنے کے لئے تھی۔ ہمیں تنقید نظر انداز کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی بے حس ہو کر اس کے منفی اثرات سے بچا جاسکتا ہے۔ اس کا واحد حل اس صحیح طریقہ پر عمل کرنا ہے کہ جس سے تنقید کو اپنا دشمن سمجھنے یا بنانے کے بجائے اسے اپنا اتحادی یا حلیف بنا لیا جائے۔ اس کا انحصار مندرجہ ذیل تین امور پر ہے۔

(۱) تنقید کا ماخذ۔ (۲) تنقید کی صحت (درستی)۔ (۳) آپ کا ردعمل۔

فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ تنقید کو فاتح دشمن بنا کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں یا مددگار حلیف بنانا مفید سمجھتے ہیں۔ اگر فیصلہ اسے حلیف بنانے کا ہے تو پھر بے شک یہ دشمن بن کر اور حملہ کی نیت سے ہی کیوں نہ آجائے آپ اسے ڈھال بنالیں گے۔ اسے ذرا تفصیل سے دیکھتے ہیں۔

دشمنی کو دوستی میں بدلنا

خصمِ سرکش را فنا ساز از ملائم طینتی
آتشِ سوزاں ندارد چارہ جز مُردن در آب

آپ کسی ایسے فوجی سے پوچھئے جس نے کسی جنگ میں حصہ لیا ہو یا اس حوالہ سے Intelligence Work کیا ہو، وہ آپ کو بتا دے گا کہ دشمن فوجی یا جاسوس کو مارنا آسان ہے لیکن اسے اپنے ساتھ ملا لینا بے حد مشکل کام ہوتا ہے۔ تاہم اگر کسی طرح ایسا کرلیا جائے تو پھر جنگ لڑنا بے حد آسان ہو جاتا ہے اور اس 'دشمن' کی مدد سے تیر ٹھیک نشانے پر لگایا جاسکتا ہے۔ اسے مارنے سے آپ صرف اس کے منفی اثرات سے بچ سکتے ہیں لیکن اسے اپنے ساتھ ملا لینے سے فائدہ کئی گنا ہو جاتا ہے۔ آپ نہ صرف اس کے منفی اثرات سے بچ جاتے ہیں بلکہ یہ اتنی مثبت توانائی دے سکتا ہے کہ آپ جنگ جیت سکتے ہیں۔

بالکل یہی لائحہ عمل تنقید کے ساتھ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے گھر میں بیٹھ جانے، لوگوں سے روابط ترک کر لینے، تنقید کرنے والوں کو کھری کھری سنانے، اپنے آپ کو بے حس کر لینے یا تنقید کو نظر انداز کر دینے سے آپ اس کے منفی اثرات سے تو شاید کسی حد تک بچ سکیں لیکن ان ساری کوششوں سے 'ذات' کی نشوونما یا صلاحیتوں میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ دوسرے لفظوں میں تنقید کے اثرات سے خود کو بچا لینا ایک ''منفی عمل'' ہے جبکہ تنقید کو اپنا حلیف بنا لینے سے آپ اس کے منفی اثرات سے بچ جائیں گے اور یہ آپ کی شخصیت میں جادوئی ارتقاء بھی لائے گی۔

مجھے اندازہ ہے کہ یہ بات بظاہر اچھی لگ رہی ہے لیکن

آپ سوچ رہے ہیں کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ یقیناً ممکن ہے اور مزید خوشخبری یہ کہ ایسا کرنا کوئی خاص مشکل بھی نہیں! آپ نے صرف اتنا کرنا ہے کہ جب کبھی آپ پر تنقید ہو تو فیصلہ کرلیں کہ

(۱) آپ اس پر فوراً React نہیں کریں گے۔ (۲) آپ اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ (۳) آپ 'میں نہ مانوں' والا رویہ اختیار نہیں کریں گے۔ (۴) آپ فرار اختیار کرنے کے بجائے تنقید کو اپنا حلیف بنالیں گے۔

جب تنقید حملہ آور ہو تو اپنے آپ سے یہ کہیں 'میں اس پر غور کروں گا'۔ اسی طرح اگر کسی کی تنقید پر تبصرہ ضروری ہو تو آپ کا جواب بھی یہی فقرہ ہونا چاہئے 'میں اس پر ضرور غور کروں گا۔ سو پہلا مرحلہ یہ ہوا کہ آپ نے دشمن پر React کرنے' دفاعی پوزیشن اختیار کرنے یا حملہ کرنے کے بجائے تنقید پر صرف غور کرنا ہے۔ اگلے مرحلہ پر ان تین چیزوں پر آپ نے غور کرنا ہے۔

(۱) تنقید کا ماخذ (۲) تنقید کی صحت (۳) تنقید پر آپ کا ردعمل۔

اسے ذرا تفصیل سے دیکھتے ہیں۔

تنقید کا ماخذ

سب سے پہلے تو اس بات پر غور کریں کہ تنقید کہاں سے ہوئی ہے اور کیوں ہوئی ہے۔ جس نے تنقید کی کیا وہ اس کا اہل تھا۔ کیا اسے ان تمام ضروری امور کا ادراک ہے کہ جو Back Ground میں پنہاں ہیں۔ اُس نے تحقیق کے تقاضے پورے کرلئے تھے۔ قرآنِ کریم کا حکم اس بابت یہ ہے' ''جس بات کا تمہیں ذاتی طور پر علم نہ ہو (جس کی خود تحقیق نہ کرلو) اس کے پیچھے مت لگو۔ (ذاتی تحقیق کے معنی یہ ہیں کہ) تم اپنی سماعت وبصیرت (حواس) کے ذریعے معلومات حاصل کرو۔ اور پھر، ان معلومات کی بنا پر، اپنے ذہن سے فیصلہ کرو اور اس طرح صحیح نتیجہ پر پہنچو۔ اِن میں سے اگر ایک کڑی بھی گُم ہوگئی تو تمہاری تحقیق ناقص رہ جائے گی۔ سوچو کہ اس باب میں تم پر کتنی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ (مفہوم القرآن، ۱۷:۳۶، ص ۶۳۶)۔ تنقید کرنے سے پہلے کیا اس نے یہ سمجھنے کی کوشش کی تھی کہ آپ کیا کہہ یا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ آپ کے پروگرام اور مقاصد سے اسے کوئی آگاہی ہے یا محض اس وجہ سے تنقید شروع کر دی کہ اس نے ارادے اور منصوبے کو بھانپ لیا ہے۔

ہر تنقید سننے کے بعد اپنے آپ سے پوچھیے کہ کیا یہ جذبات پر مبنی ہے' ماضی کا کوئی تجربہ اس کی بنا ہے' غلط فہمی اس کی وجہ ہے' آپ کے باہمی تعلقات کی تلخی وجہ تنقید ہے یا پھر موجودہ معاملہ میں دیانتدارانہ اور حقائق پر مبنی رائے ہے۔

آپ نے یہ بھی غور کرنا ہے کہ کیا تنقید کرنے والا اپنے الفاظ کو سوچ سمجھ کر ادا کر رہا ہے۔ مثلاً اگر بیوی اپنے شوہر سے یہ کہے ''آپ نے کبھی بھی میرے جذبات کا خیال نہیں رکھا'' تو وہ درحقیقت کہنا یہ چاہتی ہے کہ جتنی اُس کی خواہش ہے اس طرح توجہ نہیں دی گئی۔ پہلے بھی کئی مواقع ایسے گزرے ہیں کہ جب توقعات کے مطابق اس کے جذبات کا کماحقہٗ احساس نہیں کیا گیا۔ اگر خاوند یہ کہتا ہے ''آپ ہمیشہ دوسرے لوگوں کی ضروریات کو میری ضروریات پر ترجیح دیتی ہیں''۔ اس میں ہمیشہ کا مطلب ''ہمیشہ'' نہیں ہے اور نہ ہی دوسرے لوگوں سے مراد عام لوگ ہیں۔ وہ اپنی بیوی سے کہنا صرف اتنا چاہتا ہے کہ اُس نے آج بھی اس کا کام نہیں کیا اور پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔ اسی طرح کسی دفتری ملازم کو اس کے باس نے یہ کہا ہو ''میں نے اپنی ساری زندگی میں تم جیسا

نااہل ور کر کبھی نہیں دیکھا۔ میں تمہیں بتادوں کہ تم کبھی ترقی نہیں کرو گے'' تو ملازم کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ صاحب بہت سمجھ دار اور تجربہ کار انسان ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے یہ مقام اپنی صلاحیتوں اور سالہا سال کی محنت کے بعد حاصل کیا ہو لیکن کیا وہ اس کی اہلیت بھی رکھتے ہیں کہ مستقبل کے ''حال'' بتا سکیں۔ انہیں قسمت کا حال بتانے والے ''پروفیسر'' ہونے کا دعویٰ بھی نہیں ہوگا۔ ویسے بھی جو شخص اپنی قسمت آپ بنانے پر یقین رکھتا ہو، اُس کے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔

اگر ہم موصوف کی تنقید کا جائزہ لیں تو ان کی پہلی بات صحیح ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی میں ایسا نااہل ور کر نہ دیکھا ہو لیکن ان کی دوسری بات یا دعویٰ بالکل غلط ہے کہ اُن کا ماتحت کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ تنقید کے ماخذ کا جائزہ لینے سے ہمیں مل گئی۔ یہ صاحب کسی کے مستقبل کے متعلق تنقید کرنے کے اہل نہیں تھے۔

بچوں کے لئے ماں باپ کی تنقید کے حوالہ سے 'ماخذ' پر غور کرنا بے حد اہم ہے۔ بالخصوص جب ماں اپنی بیٹی کے متعلق یہ ریمارکس دیتی ہے کہ ''تم جہاں بھی جاؤ گی' اُن کا ستیاناس کرو گی'' تو اس کی تنقید کو دل پر لے لینے کے بجائے ایک بیٹی کو اس تنقید' طنز یا تنبیہہ کے مقصد پر غور کرنا چاہئے۔ ماں یہ چاہتی ہے کہ اس کی بیٹی مزید سنجیدگی سے گھر گرہستی کے امور پر توجہ دے۔ بیٹی اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے نہ تو اپنا دفاع شروع کر دے' نہ ہی ترکی بہ ترکی جواب دے اور نہ ہی منہ بنائے۔ ماخذ پر غور کرنے سے اندازہ ہو جائے گا کہ ماں نہ تو مستقبل کے حالات جانتی ہے اور نہ ہی وہ سائیکالوجسٹ ہے۔ ماں کی اس طرح کی تنقید سے اس کے خیر خواہانہ جذبات' محبت اور Concern کا اظہار ہوتا ہے اور بس!

تنقید کی صحت پر غور

تنقید کو اپنا دوست بنانے کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ آپ تنقید کی صحت پر غور کریں۔

تنقید کی مثال پانی سے بھری ایک بالٹی کی ہے جس کی تہہ میں تھوڑی سی ریت پڑی ہے اور اس ریت میں کبھی کبھار سونے کے ذرات بھی چھپے ہوتے ہیں۔ جب کوئی تنقید کرتا ہے تو دراصل وہ پانی کی یہ بالٹی آپ پر پھینک رہا ہوتا ہے۔ اس مرحلہ پر آپ کا فطری ردعمل مندرجہ ذیل میں سے ایک ہوگا۔

(۱) بچ بچا کر بھاگ جاؤ۔ (۲) پھینکنے والے کا ہاتھ روک کر اپنے آپ کو بچاؤ۔ (۳) سخت غصے میں آ کر اس پر حملہ کر دو۔

بے شک یہ تینوں فطری ردعمل ہیں لیکن ذرا غور کریں تو ہیں بالکل ہی غلط۔

یہ صرف پانی کی بالٹی ہی تو تھی، سیمنٹ، تارکول یا آگ سے بھرا ہوا برتن نہ تھا۔ بھلا آج تک پانی کی ایک بالٹی سے کسی کو سخت زخمی ہوتے آپ نے دیکھا ہے۔

آپ سوچئے اگر کوئی آپ پر پانی کی بالٹی پھینکے تو زیادہ سے زیادہ کیا ہو جائے گا؟ پانی سے جسم اور کپڑے بھیگ جائیں گے اور آپ کو تھوڑی سی زحمت ہوگی۔ لیکن ہے تو پانی ہی نا! تولیہ سے خشک کیا جا سکتا ہے یا کچھ وقت کے بعد خود بخود خشک ہو جائے گا۔ تہہ میں جو ریت تھی وہ چہرے پر پڑ سکتی ہے بلکہ تھوڑی سی آنکھوں میں چلے جانے کا احتمال ہے۔ کچھ وقت کے لئے آنکھیں کام نہیں

کریں گی شاید تکلیف تھوڑی سی بڑھ بھی جائے۔ آپ دو چار پانی کے چھینٹے ماریں گے تو یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔

اسی طرح آپ تنقید کے ماخذ اور اس کی صحت کا جائزہ لیں گے تو بات اتنی بڑی نہیں رہے گی۔ اہم بات یہ ہے کہ فوری طور پر React نہ کریں بلکہ غور کریں۔ غور کرنے سے اگر معلوم ہو کہ تنقید برحق ہے تو آپ کو سونے کے ذرات مل گئے جو کہ ریت کی تہہ میں تھے۔ آپ اسے استعمال میں لاتے ہوئے اپنی شخصیت میں حسبِ ضرورت تبدیلی لائیں۔

میرے خیال میں تنقید چاہے کتنی بے بنیاد کیوں نہ ہو' اس میں بہت ہی تھوڑا سہی 'سونا' ہوتا ضرور ہے۔ جہاں بالٹی کا پانی بہت گدلا ہو اور ریت زیادہ ہو' وہاں سونا عموماً انتہائی باریک ذرات کی صورت میں ہوتا ہے۔ مثلاً اس مثال کو سامنے لائیں کہ جس میں باس نے کہا تھا ''میں نے اپنی ساری زندگی میں تم جیسا نااہل ورکر کبھی نہیں دیکھا۔ میں تمہیں بتا دوں کہ تم کبھی ترقی نہیں کرو گے''۔ بلاشبہ یہ مبالغہ کی انتہا ہے تاہم آپ غور کریں تو فائدے کا کوئی پہلو اس میں بھی موجود ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہی کہ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس دفتر میں مزید کام کرتے رہنا مفید نہیں ہوگا سو اپنی ذاتی اور پروفیشنل زندگی میں مزید بہتری لانا بڑا ضروری ہے۔ یہ تنقید Self Discovery کی دعوت بھی دے رہی ہے۔

اب آپ چند لمحوں کے لئے پڑھنا بند کر کے سوچیں کہ گزشتہ چند ہفتوں میں آپ پر کسی ایسی شخصیت نے تنقید کی جس کا آپ دل سے احترام کرتے ہوں۔ یاد کیجئے کہ آپ کا ردِعمل کیا تھا؟ آپ نے سنی ان سنی کر دی، منہ بسور لیا، اپنا دفاع کیا یا احترام کو بالائے طاق رکھ کر کھری کھری سنائیں۔ پھر یہ بھی غور کریں کہ تنقید کا ماخذ کون تھا اور کیا تنقید برحق تھی۔ اس میں کہیں اچھا خاصا سونا تو نہیں تھا جس پر اب تک آپ نے توجہ ہی نہیں دی۔ کوشش کریں کہ اس ''سونے'' کو استعمال میں لائیں۔

تنقید پر آپ کا ردعمل

تنقید کو اپنا حلیف بنانے کا تیسرا اور آخری مرحلہ یہ ہے کہ تنقید پر آپ کا ردعمل کیسا ہونا چاہئے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ تنقید کو بدتر دشمن یا بہترین دوست بنانے کا انحصار اس کے ماخذ' صحت اور آپ کے ردعمل پر ہے۔ ایک مختصر سی کہانی سے مکمل صورت حال اور نکھر کر سامنے آ جائے گی۔

''ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک نیا شادی شدہ جوڑا پوری تیاری کے ساتھ شہر کے ایک ایسے ریستوران پر گیا جو اپنی انفرادی خصوصیات کی بنا پر نہایت شہرت رکھتا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی انہیں طوطے نے اپنی مخصوص آواز میں چیختے ہوئے خوش آمدید کہا۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ دلہا نے خوش ہو کر طوطے کی طرف دیکھا تو طوطے نے جھٹ سے 'السلام علیکم' کہہ دیا۔ جوڑے نے وعلیکم السلام کہہ کر اپنے قدم آگے بڑھا دیئے۔ طوطا پھر بولا ''ذرا سنئے''۔ دلہا صاحب نے طوطے کی نقل اتارتے ہوئے کہا ''جی فرمائیے''۔ طوطا بولا ''تم نرے جاہل اور بدھو ہو اور تمہاری بیوی انتہائی بدصورت''۔ دلہن نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ دلہا صاحب طیش میں آ گئے اور وہیں سے منیجر چیخنا شروع کر دیا۔ ہال میں بیٹھے سب لوگ حیران ہو کر انہیں تکنے لگے اور یوں منیجر کے آتے آتے اچھا خاصا تماشا بن گیا۔

منیجر نے ادب سے معاملہ پوچھا تو دلہا نے ساری بات بتا کر سخت احتجاج کیا کہ آپ نے ہمارا سارا پروگرام تباہ کر دیا۔

وغیرہ وغیرہ۔

منیجر کے منہ سے بے ساختہ نکلا ''مجھے یقین نہیں آتا کہ اس نے پھر وہی حرکت کی ہے''۔ اس نے پنجرہ کھولا' طوطے کو پکڑ کر باہر نکالا۔ ایک دو دکھاوے کے چپت رسید کئے اور خوب ڈانٹا! جوڑے کا اطمینان ہوا تو منیجر نے معذرت کے بعد انہیں خصوصی نشست دی۔ کھانا کھا کر جب دوبارہ دروازے پر پہنچے تو منیجر نے پھر معذرت کی اور طوطے نے ''خدا حافظ'' کہا۔ ابھی وہ نکل ہی رہے تھے کہ طوطا بول پڑا ''ذرا سنئے گا''۔ ''جی فرمایئے گا'' دلہا نے غضب ناک ہو کر کہا۔ طوطے نے روہانسی آواز میں کہا ''آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں کیا فرمانا چاہتا ہوں''۔

یہ تمثیل میں نے تین نکات کی وضاحت کے لئے عرض کی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ طوطا سمجھ دار تھا یا یہ جوڑا؟ میرے خیال میں تو طوطا سمجھدار تھا۔ اس جوڑے کو طوطے کی بات کا برا منا کر اتنا ہنگامہ برپا کرنے اور تماشا بننے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ انہیں کرنا صرف یہ چاہئے تھا کہ وہ تنقید کے ماخذ' اس کی صحت پر غور کرتے اور اپنے ردِعمل کو کنٹرول کرتے۔ وہ صرف طوطا ہی تو تھا کالج کا کوئی پروفیسر یا ماڈلنگ ایجنسی کا مالک نہ تھا کہ جو کسی کے سمجھدار یا خوبصورت ہونے نہ ہونے کا فیصلہ کرنے کے اہل ہوں۔ زیادہ سے زیادہ وہ تنقید پر غور کرتے نہ کہ اپنے ردِعمل کا فوری اظہار کر کے اپنی بیوقوفی کا اعلان کرنے لگ جاتے۔ طوطے کی اس بات کا جواب اگر ضروری تھا تو صرف اتنا ہی کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو کہتے کہ ''بھلا ایک طوطا یہ معاملات کیا جانے''۔

اگر ہم اس جوڑے کے ردِعمل کا تجزیہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ دلہا واقعی بدھو تھا اور شاید دلہن خوبصورت نہ تھی۔ اس پانی کی بالٹی میں سونا یہ ہے کہ دلہا کو اپنی Personal Development پر غور کرنا چاہئے اور دلہن اپنے موجود سٹائل میں کچھ بہتری لانے کے متعلق سوچے یا اپنی وضع قطع میں حسبِ ضرورت تبدیلی کے ممکنہ حل کا جائزہ لے۔

صاحبو! دنیا ایسے ''طوطوں'' سے بھری پڑی ہے کہ جو یہ سوچے بغیر غیر ذمہ دارانہ تنقید کرتے رہتے ہیں کہ وہ اس کے اہل ہیں بھی یا نہیں۔ میں اور آپ اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ ہماری ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ ہونے والی تنقید پر اپنے ردِعمل کو کنٹرول کریں۔ انہیں بالٹی پھینکنے دیں ور اطمینان سے پانی پونچھ ڈالیں۔ آنکھوں میں سے ریت کے ذرات دھو کر سکون سے سونے کے ذرات تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

اگر آپ ایسا کریں گے تو تنقید سے آپ کی دوستی پختہ تر ہوتی جائے گی۔ یہ آپ کی عقل وخرد میں اضافہ اور عملی زندگی میں مزید بہتری اور ترقی کا باعث بنے گی۔ شروع میں آپ کو ذرا محنت کرنا پڑے گی کہ اپنا ردِعمل سوچ سمجھ کر دینا ہوگا۔ صرف چند ماہ کی شعوری کوشش سے آپ اسے اپنی عادتِ ثانیہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اس طرح آپ کی آئندہ زندگی بے شمار الجھنوں سے بچ جائے گی۔

آخر میں ایک مشق کے ذریعے ان تفاصیل کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔ ان نکات پر غور کرنے سے آپ کا عملی کام کافی آسان ہو جائے گا۔

(۱) چند ناقابلِ فراموش 'تنقیدوں' کی لسٹ بنائیں جو آپ کو گھریا کام پر سننے کو ملی ہوں۔

(۲) ہر تنقید کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیتے ہوئے غور کریں کہ تنقید

کرنے والی شخصیت متعلقہ شعبہ میں ماہر ہے۔

(۳) ہر تنقید کا مزید غور کرتے ہوئے وجوہات لکھیں کہ تنقید کی بنیاد تھی۔ مثلاً

(الف) یہ جذبات پر مبنی تھی۔

(ب) کوئی ماضی کی تلخی یا تلخ نوائی اس کی وجہ تھی۔

(ج) کسی غلط فہمی کی وجہ سے آپ پر تنقید کی گئی۔

(د) اس میں کوئی سنجیدہ پہلو تھا یا تنقید برائے تنقید تھی۔

(ر) متعلقہ معاملات میں حقائق کو سمجھتے ہوئے تنقید کی گئی۔

(س) تنقید کا ایک طریقہ تجویز ہوا کرتا ہے۔ کیا یہ تجویز تحقیق کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر دی گئی ہے؟

(۴) تنقید کا جذبۂ محرکہ کیا ہے؟ یہ آپ یا آپ کے منصوبوں سے محبت یا Concern کا اظہار ہے۔ خود غرضی، حسد، خطرات، غصہ، نفرت یا ذہنی ناپختگی تنقید کا جذبۂ محرکہ بنی ہے۔

(۵) تنقید کی صحت پر غور کریں۔

(الف) پانی کتنا تھا۔ یعنی کتنی باتیں مبالغہ آمیز یا مبہم ہیں۔

(ب) ریت کی مقدار کتنی تھی۔ یعنی کتنا حصہ زیادہ تکلیف دہ اور کرب ناک ہے (اس میں مخصوص الفاظ کا استعمال، اندازِ گفتگو وغیرہ شامل ہیں)۔

(ج) سونا کتنا تھا۔ ایسا سچ کہ جو تنقید سے اخذ کیا جا سکتا ہے اور جو آپ کی زندگی میں نکھار لانے کا سبب بن سکتا ہے۔

(۶) تنقید پر آپ کا ردِعمل کیا رہا تھا۔ آپ نے دفاع شروع کر دیا تھا کہ نہیں۔ نہیں جی نہیں۔۔۔ بات دراصل یہ ہے وغیرہ۔ بالکل انکار کر دیا تھا کہ سب بکواس ہے وغیرہ۔ الزامات کی بوچھاڑ کر دی تھی کہ تمہارا تو کام یہی ہے وغیرہ۔ آپ چپ کر کے، بے حس ہو کر کام چلاتے رہے وغیرہ۔ یا آپ نے بات توجہ سے سنی اور شکریہ ادا کیا کہ آپ کو آپ کی غلطی کا احساس دلایا گیا۔ یا آپ نے تنقید کرنے والے کو اطمینان سے سمجھا دیا تا کہ وہ آپ یا آپ کے کام کو سمجھ سکے۔

(۷) اس مضمون کے مطالعہ کے بعد آپ سوچیں کہ آپ کو کسی خاص ناقابلِ فراموش تنقید میں کیا کرنا چاہئے تھا جس سے آپ کی شخصیت میں بہتری آتی اور تنقید کرنے والے سے آپ کے تعلقات بھی اچھے رہ سکتے۔

(۸) سب سے آخر میں تفصیل سے وہ بہترین طریقے لکھیں کہ جن کے مطابق آپ مستقبل میں تنقید پر ردِعمل کریں گے۔

(Simple Steps to Impossible Dreams سے ماخوذ)

ENJOY YOUR STAY AT

HOTEL PARKWAY (PVT.) LTD.

Near Railway Station - Lahore

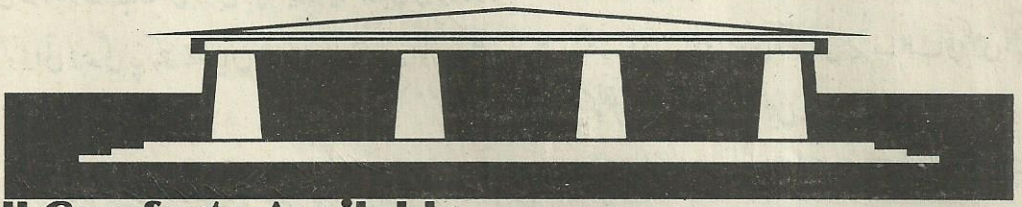

All Comforts Available:

- T.V. & Fax
- Air-Conditioned
- Telephone Exchange
- Car Parking
- Excellent Service

Ph:92-42-6315647-52–FAX:92-42-6366029

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تبصرہ کتب

کتاب: **مجالس اقبال** مصنف: **جعفر بلوچ** تبصرہ نگار: **ڈاکٹر صلاح الدین اکبر**

علامہ اقبالؒ کے پیغام' ان کی شاعرانہ عظمت' ان کی سیاسی زندگی اور برصغیر کی سیاست میں مثبت کردار پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جائیں گی۔ اقبال کی فکر کے اولین ماخذ پر پرویز صاحب نے بھی اقبال اور قرآن کے نام سے دو ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ عاشق بٹالوی کی کئی سو صفحوں پر پھیلی ہوئی کتاب اقبال کے آخری دو سال۔ ان کی صرف دو سال کی سیاسی سرگرمیوں پر مبنی ہے۔

ان کی ذاتی زندگی کے متعلق ان کے سوانح نگار سید نذیر نیازی کی ''دانائے راز'' صرف ایک ہی جلد تک پہنچ سکی' ان کا ارادہ تین جلدوں کا تھا اس لئے اسے بھی تشنہ ہی سمجھنا چاہئے۔ ان کی اقبال کے حضور نشستیں اور گفتگوئیں یقیناً ایک قابل قدر مجموعہ ہے۔ اسی طرح فقیر سید وحید الدین کی روزگار فقیر کو ذاتی زندگی پہ کچھ جھلکیاں ہی کہا جا سکتا ہے اور وہ بھی ہلکے پھلکے انداز میں۔

جناب جعفر بلوچ کی کتاب 'مجالس اقبال' اس سلسلے میں قابل قدر اضافہ ہے۔ ان کی یہ تالیف گواہی دے رہی ہے کہ انہوں نے کس محنت اور کس لگن سے علامہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پہ روشنی ڈالنے والے واقعات جو ان کی علمی ادبی' سیاسی کے علاوہ ذاتی زندگی پہ محیط ہیں اور جو مختلف اصحاب کی زبانی بیان ہوئے ایک جگہ اکٹھے کئے ہیں کہ کوئی بھی حلقہ بگوش اقبال داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میر غلام بھیک نیرنگ کی طویل رفاقت جو گورنمنٹ کالج کے زمانہ طالب علمی کی محفلوں سے شروع ہو کر الور کے مسلمانوں کی مدد کے لئے مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے وائسرائے سے ملنے والے وفد کے ممبر' تحریک تبلیغ اور یورپین مسلم کانفرنس' مصری وفد کی پذیرائی تک پھیلی ہوئی ہے' ایک بصیرت افروز تحریر ہے۔ اور بھی بہت سے خیال افروز اور معلومات افزا مضامین جمع ہیں' ان سب کا ذکر تو نہیں ہو سکتا' مختصراً ایک دو کی نشاندہی ضرور کروں گا کہ ان میں کئے گئے انکشافات اس مرد خود آگاہ کے کردار کی بلندی کی گواہی دیتے ہیں۔ مگر یہ بھی زیادتی ہوگی اگر میں میر صاحب کی لکھی ایک دو باتوں کو نقل نہ کروں' لکھتے ہیں۔

''اقبال کے مکان پر پہنچنے کے بعد صبح کی نماز کا وقت باقی تھا میں اوپر پہنچا تو ایک کمرے سے تلاوت کلام اللہ کی بلند مگر نہایت شیریں اور درد انگیز آواز میرے کانوں میں آئی' میں نے فوراً جلدی جلدی وضو کیا اور

نماز پڑھنے کے لئے اس کمرے میں گیا' دیکھا کہ اقبال مصلے پر بیٹھے قرآن حکیم پڑھ رہے تھے' مجھ کو دیکھ کر انہوں نے مصلیٰ خالی کر دیا۔ میں نے اس مصلے پر نماز پڑھی تو نماز میں خاص کیفیت محسوس کی اور میں نے اپنے دل میں اس وقت یہ کہا کہ یہ کیفیت وہ شخص یہاں چھوڑ گیا ہے جو ابھی ابھی یہاں بیٹھا ہوا کلام اللہ پڑھ رہا تھا۔''

حکیم یوسف حسن صاحب کا مضمون جس کا وہ خود یہ کہہ کر تعارف کراتے ہیں کہ۔۔''ان کے عقیدت مندوں کے قریب کھڑے ہو کر جو کچھ دیکھا اس میں سے چند حقائق کے موتی یکجا کر دیے ہیں'' خاصا معلومات افزا ہے خاص طور پر دو واقعات جو انہوں نے بیان کئے ہیں ان کی عظمت کردار پر دلیل ہیں' ایک تو نواب بہاولپور کے وکیل کے طور پر وائسرائے سے ملاقات عزت نفس کا پاس اور جرأت کہ اس دور میں وائسرائے ہند کی بات کا رد یا دعوت سے انکار۔۔ (میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا) اور اسی سلسلے کا دوسرا واقعہ کہ نواب صاحب کے شکریے کے تار کے ساتھ فرمائش کہ ''ملاقات کے لئے بہاولپور آئیے'' اور علامہ کا جواب۔۔ جو آپ نے مخاطب سے کہا ''لکھ دیجئے فرصت نہیں۔''

یہاں عطاء الرحمٰن کو مضمون جو ان سے انگریزی شاعری بطور طالب علم پڑھ چکے تھے علامہ کا بطور استاد اور بعد میں بطور ایک حاضری دینے والے اور سامع کے' قابل توجہ ہے۔۔ یوسف سلیم چشتی صاحب نے البتہ فلسفیانہ اور صوفیانہ مضامین کا ذکر چھیڑا ہے۔ اور بھی بہت سے مضمون ہیں' دونوں قریب بیٹھنے والے راجہ حسن اختر کا مرد قلندر کی بارگاہ میں۔۔ خواجہ عبدالوحید کا طویل مضمون' اسد ملتانی کا معلومات افزا فیضان اقبال۔۔ مگر یہ تذکرہ نامکمل رہے گا اگر میں حفیظ جالندھری کا ذکر کئے بغیر یہ تبصرہ ختم کر دوں۔ وہ کہتے ہیں ''مجھے اعتراف ہے کہ میں نہ تو اقبال کے حلقہ احباب میں شامل تھا نہ مجھے مریدان خاص الخاص میں شمار ہونے کا کسی بھی رنگ ڈھنگ سے دعویٰ ہے البتہ میں باریاب تھا اور وہ مجھ پر مہربان تھے۔ اس مہر و کرم کا سبب میرا نیاز مندانہ خاموش انداز تھا'' اور چراغ حسن حسرت کی زبانی یہ تذکرہ سنا کر آپ سے رخصت چاہتا ہوں۔۔ بڑی بصیرت افروز بات ہے:

''ایک شخص نے جو اکثر ان کے ہاں آیا کرتا تھا ان سے کہا ''مجھے عشق ہو گیا ہے' میں آپ کے ہاں ہر شام اس لئے چلا آتا ہوں کہ آپ کی باتوں سے مجھے کچھ تسکین ہوتی ہے' بتایئے میں کیا کروں۔''

تھوڑی دیر چپکے بیٹھے رہے پھر پوچھا ''اس معاملہ میں تمہاری نیت ٹھیک ہے''

''جی ہاں میری نیت تو درست ہے''

''کامیابی کی کوئی صورت نہیں؟''

''مجھے تو قطعاً مایوسی ہو چکی ہے''

''پھر تم کیا چاہتے ہو؟''

''یہی کہ میرے قلب کو سکون ہو جائے''

''تو قرآن پڑھا کرو **الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔**''

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب المراسلات

لائق صد احترام پروفیسر سید اعجاز احمد صاحب، چک جھمرہ۔

السلام علیکم!

آپ کا قلم، اظہار بیان اور اس سے پہلے تخیل، ماشاءاللہ باکمال ہے۔ گزشتہ ماہ آپ کا گرامی نامہ موصول بھی ہوا تھا اور ''طلوع اسلام'' میں بھی پڑھا تھا۔ جناب محترم آپ ایک دیدہ ور ہستی ہیں۔ میری کاوشوں پر آپ کا تبصرہ ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ میں نے آپ کی خدمت میں جو جواب ارسال کیا تھا، امید ہے آپ تک پہنچ گیا ہوگا۔ اور ''خراج عقیدت'' بھی۔

اس وقت جون کا شمارہ میرے سامنے ہے جس میں صفحہ 47 پر آپ کی جانب سے ''ڈاکٹر شبیر احمد کے نام کھلا خط'' شائع ہوا ہے۔ خط کیا ہے؟ موتیوں کی مالا ہے اور محبت اور تنقید کا حسین امتزاج! اب میں سلسلے وار آپ کے گرامی نامے کے اہم نکات پر کچھ عرض کرتا ہوں۔

۱۔ آپ نے شروع کے دو تین پیراگراف میں جو حوصلہ افزائی فرمائی ہے اس کے لئے میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ ہر چند کہ جن بزرگوں کے نام نامی آپ نے درج فرمائے ہیں، مجھے ان کے مقام تک پہنچنے کے لئے بہت وقت اور خون جگر درکار ہے۔

۲۔ ازراہ کرم پہلی فرصت میں رائے دیجئے کہ ''اسلام کے مجرم'' والا کام کس اسلوب سے آگے بڑھانا چاہئے۔

۳۔ آپ نے جو فرمایا ہے ''اصل کام کرنے کا کچھ اور ہے'' اس کی بھی نشاندہی ضرور فرمائیے۔

۴۔ جناب محترم! مغربی دنیا ہی میں نہیں مشرق میں بھی اپنے ہفتے وار اردو کالموں اور اردو و انگریزی کتابوں کے ذریعے میں اپنی بساط کے مطابق فکر قرآنی کے لئے شب و روز جہاد میں زندگی وقف کر چکا ہوں۔

۵۔ میری کتابیں، کالم، انٹرنیٹ ویب سائٹ سب میں انتہائی قوت کے ساتھ یہ بات کہی جاتی ہے کہ علامہ غلام احمد پرویزؒ ملت اسلامیہ کے اور بنی نوع انسان کے ایسے دیدہ ور تھے جن کی تلاش میں ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے۔ شاید میرا تمام لٹریچر اور انٹرنیٹ پیغام آپ کی فاضل نگاہوں سے نہیں گزرا۔

۶۔ میں تو بار بار یہ بات لکھتا ہوں کہ قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے۔ اور ایسے لوگوں سے نبی کریمؐ کا کوئی واسطہ نہیں رہتا اور یہی اہم ترین سبق ہے جو علامہ پرویزؒ نے قوم کو پڑھانے کی بہترین کوشش کی۔

۷۔ اگر میری کسی کتاب میں ''پرویزی فرقہ'' آپ کی نگاہ سے گزرا ہے تو وہ کسی ناقد یا ناقدین کا جواب ہوگا۔ یا نادانستہ چوک

ہوگئی ہوگی۔

۸۔ میں آپ کی توجہ فرمائی کے جواب میں ببانگ دہل یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ علامہ پرویز پر فرقہ بندی کا الزام لگانا جہالت ہی نہیں گناہ کبیرہ ہے۔

۹۔ آپ کے ارشادات میں ایک دو اہم باتیں شامل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ 1990ء سے میں نے اپنے ماہنامہ ''کہکشاں'' کا اجراء کیا اور 1993ء میں امریکہ، کینیڈا، یورپ اور برصغیر کے کئی اخباروں میں ''دستک'' کے عنوان سے ہفتہ وار کالم لکھنے شروع کئے۔ اسی زمانے سے لوگ مجھے بطور ادیب، مصنف اور شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ انکساری کے ساتھ یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ میرے قارئین صرف حلقۂ طلوع اسلام تک محدود نہیں ہیں ہر چند کہ شمع قرآنی کے پروانے اور ان کی فکر میرے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔

آپ نے یہ بھی نوٹ فرمایا ہوگا کہ میں نے اپنی توفیق کے مطابق بابا جیؒ کی خدمات کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی اللہ نے میری کتابوں کو مقبولیت بخشی ہے۔

۱۰۔ ابھی کل یعنی 9 جون 2002ء کو ساڑھے پانچ مہینے کی مسلسل محنت کے بعد الحمد للہ میں نے قرآن کریم کا مفہوم "Quran as I understand" مکمل کیا ہے۔ اگر آپ میرا ویب سائٹ ملاحظہ فرما سکیں۔ QAIU.ORG یا galaxy-dastak.com تو آپ دیکھیں گے کہ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، برطانیہ، ہندوستان، اٹلی، تائیوان، امریکہ اور کینیڈا میں لوگوں نے دین حق قبول کیا ہے۔ بے شمار احباب اب اردو پیشکش کی فرمائش کر رہے ہیں۔

۱۱۔ نہایت ادب کے ساتھ آپ کی خدمت میں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ بابا جیؒ کی 1985ء میں وفات کے بعد وقت کچھ اور آگے بڑھ گیا ہے۔ حالات کے نئے تقاضے سامنے آرہے ہیں۔ مغرب میں مکین ہونے کی وجہ سے ہمیں یہود و نصاریٰ کے بھرپور چیلنج کا بھی سامنا ہے۔ قرآن کریم اور دین حق کی سچی خدمت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان حالات سے آگاہ رہیں اور کسی محترم ہستی کے سحر میں اس طرح گرفتار نہ ہو جائیں کہ ہماری پیش رفت رک جائے۔ شخصیت پرستی آپ خوب جانتے ہیں شرک سے کم نہیں۔

۱۲۔ میں نے ''قرآن میری نظر میں'' انگریزی میں جب پیش کیا ہے تو میرے لئے خود یہ حیرت کا مقام تھا کہ متعدد جگہ مجھے احترام کے ساتھ سرسید احمد خان، علامہ مشرقی، مفتی محمد عبدہ، علامہ اقبال اور علامہ پرویز سے جدا رائے اختیار کرنی پڑی۔ آپ کی خدمت میں صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

سورہ بقرہ آیت نمبر 224۔ جہاں تقریباً سبھی مفسرین نے لکھا ہے ''تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں۔'' میں نے اپنے مفہوم میں اسے یوں بیان کیا ہے۔ ''یاد رکھو! کہ معاشرے کی خواتین اس طرح تمہاری آئندہ نسل کی نگہبان ہیں جس طرح باغ میں رنگ برنگے پھولدار پودے پروان چڑھتے ہیں لہٰذا معاشرے میں جب بھی خواتین سے ملو تو احترام کے ساتھ اور مستقبل کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو۔'' اس آیت میں آپ نوٹ کریں گے کہ ''ازواج'' نہیں ''نساء'' فرمایا گیا ہے۔

''نساؤکم حرث لکم''

محترم پروفیسر صاحب! آپ کی رائے اور تنقید کو میں ہمیشہ مشعل راہ سمجھوں گا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے اور دونوں جہانوں میں فوز و فلاح سے نوازے۔

مخلص ڈاکٹر شبیر احمد۔

(بقلم بیگم فریدہ شبیر)

having less of a compassion than is needed. So who is going to fulfill or compensate for the rest of compassion? Quran does not communicate with humankind in abstract ideas. The root word for 'Rahman' and 'Raheem' is R'ham, which means womb. When we human beings begin to live like one big Quranic family in this world, it is Allah's promise, each one will be provided protection, that is R'ham, by the Islamic System, like a child is provided protection in his embryonic phase in the womb of its mother. This example reveals that Allah's system is not cold justice to the growth and development of a human being. The doings of nature are perfect examples for us, if only we change ourselves and start looking towards natural laws, rather than man made systems. The Islamic System will act like a mother's womb acts towards the growth of every human being. In the womb of a mother, there is no surmise or assumption as to how much mercy, tenderness or compassion is needed. All the cells in the womb, in this process, interact for the development and growth of all body organs of a human being, in complete harmony with each other.

When the embryonic phase of a child is complete, when its nourishment and development is complete, it begins to force itself out of this womb, in order to begin its next phase of life, as a complete human being. Now this certainly deserves to be called "Justice." In nature, we observe, when one phase of justice is complete, it starts to enforce its next phase, without any waste of time. This new born child is no local, partial or contemporary child. This will not be an abstract child existing in anyone's imagination, but a universal child, who could be born in any family. Natural process does not discriminate between Christian, Jew, Hindu, Buddhist or Muslim child. And no sane person will doubt, a child who comes in this world is not "Just Ice." It is man made systems that turn the child into ice later, when the child begins to interact with other ice bergs, and fails to understand why he/she is being left alone in the house, when his/her parents want to enjoy the bewildering and complex world outside which they have made for themselves? Why the career woman wants to leave her child at the mercy of baby sitters, who are out there doing business on human lives? Our modern mothers have learnt to give everything in tiny, small quantities, including love and compassion.

And I wish to ask your leave now with Professor Dixon's words, who says, "The reformers have, indeed, a strong preference for tepid, anemic folk. But do tepid emotions possess any driving force? To desire nothing at all was the Stoic prescription for a good life; to desire very little, and that half-heartedly, seems to be the panacea for the world's ills recommended by our modern doctors."

****

organ out of any part of itself. Utterly unlike any machine, the cells too, in living things can act for each other, and work together for a common purpose. This co-operation of parts is everywhere present in natural organisms. What governs the procedure? Who or what presides over the organization? Where dwells the wisdom in the germ capable of detecting deficiencies in itself when they arise, where the intelligence, for it certainly simulates intelligence, which can transfer to the remaining parts duties previously performed by others? ...this speck of life, which is a whirlwind of billions of electrons, revolving in their orbits about 7000 million times in the millionth of a second – contains within itself the power of becoming a human being, with all its organs complete, brain, heart and lungs...This speck of matter contains within itself these noteworthy powers.... Aristotle thought," he further writes, "there was nothing in the end that was not in a measure in the beginning. The beginning was prophetic, it foretold what was yet to come."

This mind boggling analysis tells us, there is a purpose to Life. From the very start, the immaculate precision of zillions of atoms and molecules of our bodies, co-ordinate with each other, to make the human body. And yet, when it comes to the human bodies interaction with each other, we observe more than often, they fail in their coordination. You may insist, it is inherent and in the nature of human destiny. In stone age you would have argued, it is our inherent need to live in caves. That every matter which has a beginning, must also have an end. If the aim and purpose of the miraculous coordination of zillions of atoms, lies only in the disintegration of our bodies, would it not be the most expensive and ridiculous jokes ever played? As the Sufis and Saints have us believe in their religious hymns and songs:

"Authey key par'wah ay raa'qub, authey bay par'wahyan" (Punjabi)

Again from the Quran I understand, the sole purpose of our present Life is to strive for Heaven. And that can be achieved, when humankind lives as one big family on this exotic earth. But in practice we observe that mankind is more inclined towards immediate gains. Even, as you probably will say, if my assumption is not true; that Quran is being interpreted by everyone differently, is the sure cause of divisions among the Muslims. Therefore the solemn promise of Allah, of peace and justice on this earth, is not being accomplished. But the English word justice does not explain the Quranic meaning of justice. Quran defies that any other system will become null and void before Islam. And justice will break into just ice, if not appropriately understood.

The two words for justice, used in the opening chapter of Quran are 'Rahman' and 'Raheem.' Both mean kindheartedness, tenderness, compassion and mercy. Again this does not fully explain to us the true meaning of justice. You may be

against it, I thought you would prefer me to tell you point blank in what I believed. Since philosophies and science cannot function in a vacuum, and as with every man's experience, yours may be different. You see the virtuous are sad and how cheerful and light-hearted so often the profane - and so you may be obliged to think differently! Yet, hardly do we realize that to give any kind of interpretation of human Life, we must first see it steadily and see it in its complete scenario.

You must trust your mind, we are often told, but not your heart's desire. And we read in the Quran, when it talks about the wise as, *"those who do not forsaketh reason for these ay'aa.....(25:73)"* In other words not to believe the outrageously absurd that takes our fancy. You may perhaps say that to strip the human life of all its aspirations and imagination would be an unwarranted mutilation of human nature. You may comfort yourself in all kinds of practical examples surrounding your argument. Who am I, all the world's philosophies shall not be able to convince you or change the private script of your imagination. What havoc and holocausts we face in every century, only proves the powers that human imagination possesses. We are brainwashed to believe, "History repeats itself." After observing the disasters of history I would like to agree to that statement. But if history repeated itself and we are moving in circles, then I also read the words in the Quran, *"Eh'de Nus'sira'tul Mus'taqeem."* By reading the whole of Quran, I reach a different conclusion. That Life is going in a straight path, destroying in its strides all types of absurd philosophies, each time they arise. The Quran tells me, in Nature there are laws that govern the whole Universe. And that ***historical laws*** repeat themselves – not history. And we shall keep on repeating past mistakes in history, unless and until we sincerely try to find those laws, that govern human history.

Let us go back to our main issue of argument, where to look for justice and how can we become capable to enforce, when we find it. Unless we take these first steps, it is unnecessary to proceed further. Secondly, you will agree with me, like we have to learn the principles of grammar in any language, before we can understand any piece of its literature; by the same token, we will have to know each other's way of rationalizing before we can communicate. Before we examine the concept of *justice* in a human being, we must first of all familiarize ourselves with human machinery. At present nothing better comes to my mind again, than the explanations given by Professor Dixon, on this matter. He writes:

> *"The original cell or egg was already the animal to come on a microscopic scale, that is, in miniature. Nothing so simple. That is not nature's way. The germ cell is a unity and does not become specialized for the production of the heart or lungs, or any other part of the body till it has attained a certain maturity. .... It possesses the astonishing faculty of providing any necessary*

Justice Or Just Ice!

By

Aboo B. Rana

Setting the world right has never appealed to me as a profession; for which I felt myself in any degree or fashion fitted, nor have I believed those who are leading in the endeavour especially qualified for this undertaking. Nonetheless, the relentless struggle to define justice has remained with us since ancient times. Ironically enough, individuals, cultures and nations kill and declare wars on each other, in the name of perhaps one of the most sought after words in any vocabulary, that we call *justice*. The Oxford dictionary defines *justice* in words such as, exercise of authority in the maintenance of right; just conduct; fairness; uprightness; decency; correctness; fairplay; lawfulness or judicial proceedings.

Each one of us, who has gone even for a few years to school, is familiar with this term of justice. They also say, *"Justice delayed is justice denied!"* At the same time the more we think on *justice*, the more we find ourselves going into vicious circles. If one has had a rough day at work, it is considered okay and just to have a few beers in the western cultures. And we know, this idea for relaxation and attitude would be appalling and unjust in most Muslim countries. So whose justice are we talking about? The Western cultures' justice or the Muslim world's justice? An English professor W. MacNeile Dixon narrates beautifully:

> *"You can no more escape your philosophy, than you can escape your own shadow, for it also is a reflection of yourself. Systems of thought are the shadows cast by different races, epochs and civilizations. All reasoning is in a manner biased, and the bias is due to the nature, surroundings and education of the thinker.....Mathematical reasoning is more nearly impersonal than any other type, but, as Aristotle pointed out, you do not ask it of the statesman."*

I am inclined to think, you are with me so far, even though the subject may not be very palatable to the moment. To shrink the issue of ***justice*** in its simple terms, I propose to say, justice is that which enhances and promotes Life, and unjust would be, that thwarts Life. You have only to assure yourselves that I am complete wrong, which perhaps, indeed, is likely to be the truth. And that I must learn wisdom and come to think differently. Rather than bother your mind with philosophies for a

musical session was organized by Mr. Hayat Ahmed Khan and Roshan Ara Begum staged a comeback, after a brief seminar on music in the Al-Falah Building Hall on the Mall. She gave several performances after this and music lovers were saved from a great loss.

The decades of the fifties and the sixties witnessed a great momentum in stage activity. Not only local talented actors (mostly senior students) staged plays of high caliber, there were visiting teams from Britain, Russia, China, Sri Lanka and India. Not only were Shakespearean and modern plays performed, classical and folk dances were also exhibited. The martial ballets on the Chinese revolution are unforgettable, and so are Indrani Rehman and Gopi Krishan from India; Ashura and Tamara Khanum from Central Asia (then dependencies of U.S.S.R.) were a class by themselves. I could go on and on, for apart from these stage performances the human experiences immortalized on the silver screen were something that could never be missed. These masterpieces were shared by Parwez as great and noble creative activity of the humans. He even made it a point not to miss some of the annual plays of Government College and Kinnaird College. They had a long history of dramatic performances of very high caliber. To miss them indeed would be an artistic loss.

My plea is that newcomers into the Tolu-e-Islam Movement should make a thorough study of Parwez's articles (now available in the form of pamphlets) on "Art aur Islam" and "Qiamat-e-Maujood" (Hell is Right Here). Actually his voluminous literature on the Quran is replete with exhortation of the joy of life. On the planet Earth, Humans alone are blessed with the Divine spark of creativity. The animal and vegetable kingdoms are unable to do so. Their function is limited to procreativity, while Humans can further beautify their surroundings. All living nations have done so; it is the decaying people who look down upon such activity and end up being regressive, depressed and non-creative. This is bound to lead to hypocrisy and perversion. If we are honest to ourselves, we would know where we stand today in the comity of nations. Knowing this every Quranic center should bubble with creativity, laughter and joy, so that we start living again. The Quran was not revealed to dig a graveyard, rather to resurrect it.

We are lucky and grateful that such a man as Parwez was born on the 9th of this month of July, making our lives richer and happier. With a sense of discrimination and proper evaluation, he directed us how to enjoy life to the full.

****

Perhaps one of the greatest joys in human creativity is music. To date perhaps he remains the greatest connoisseur of south-Asian classical music in his generation. The great musicians of the day became self-conscious or were inspired by his presence among the audience. I have had a chance of watching their mutual communication, the performer and the listener, sharing the delicate nuances of musical notes and a lot more. Many participants will recall that the annual conventions of Tolu-e-Islam were, without fail, concluded with a musical session. I have listened to the great Umrao Bundu Khan on the historical lawns of his home; also Mahdi Hassan during his pre-cinema phase and Nazeer Farooqi's rendering of Iqbal's poetry. Perhaps very few would be aware about Kundan Lal Saigal's early association with Parwez. These were of course pre-independence days in Delhi. As kids we were very familiar with his songs, for there was hardly a home where his records were not listened to by one and all. With a beautifully melodious voice, I was nevertheless told that he had no classical training. But he had a prolonged opportunity of listening to it at great length in Parwez's house in Delhi. I was taken aback when I learnt about this close association. Saigal's inborn talent and a good memory enabled him to reproduce the classic musical notes he had listened to. At some stage someone from Bollywood heard him and invited him to join the Bombay Talkies. While deciding to go, Parwez advised him to remain firm and steadfast in the atmosphere prevalent in such ventures. Admirers of Saigal are aware that he faltered and could not keep up with Parwez's advice. Once when a common friend told Saigal that Parwez missed him and that he should go and meet him, he replied; "How can I face him?"

One of the singers that Parwez admired most was Roshan Ara Begum. The latter too was thrilled if Parwez happened to be among the audience, someone who could genuinely and truly appreciate her greatness as a singer. She was already an accomplished artist in the post-independence days. However, as time passed, obscurantist elements in the society, the clerics, carried an on-going propaganda against music and other creative activities as un-Islamic. I remember reading in a local daily newspaper a letter by Roshan Ara Begum saying that she had decided to stop singing because it was un-Islamic. There were spate of letters from desperate readers from Pakistan, Afghanistan and India, begging her not to do so. In one of her replies she stated that when she tries to practice ('riaz'), the guilt that has been imparted by the clerical propaganda, throttles her voice and she cannot sing. Being a simple, honest Muslim, she psychologically submitted to it. I can say with confidence that Parwez alone could have convinced her that music is supreme of all arts and part of Divine creation. There is music everywhere—in the universe above and under the ocean below. Music could never be un-Islamic. So lovers of music got together, and a

JOY OF LIFE

By

Ms. Shamim Anwar

It was way back in early 1958 when Parwez moved to Lahore from Karachi, that I had a chance to talk to him at length. Prior to that it had been a question-answer correspondence with him since 1956. At the time I was a young rebel, up in arms against the inhibited, repressed, psychotic and perverted priesthood to whom anything beautiful, creative or new was blasphemy. The words "haram" and "hell" filled the air, making life ugly and meaningless. It was in such an atmosphere and state of mind that talking to Parwez, a "scholar of the Quran" (a term that I equated with "mullahism") became a red-letter day in my life. The fact is that any sign or shadow of "ghutton" (an Urdu term difficult to express in English except as "inhibition") in him would have made me run. But I stayed on, never to leave.

Parwez was an open-hearted, open-minded and an uninhibited person, full of laughter and good cheer. Even today my mind reverberates with it, that sound of laughter coming from the core and depth of his being and charging the atmosphere with its genuiness and humanity. Naturally, such a laughter cannot be disassociated from a sense of humour. He could see the funny side of life without any bitterness. He could connect things and see through the contradictions to the utter amusement of those around, be they his listeners or the avid readers of his books. Thus in whatever capacity one met him or observed him, the joy of life was the super-interaction. All the mystifying and the dusty impositions were wiped of.

Anyone who can enjoy life and throw out the bitterness must love children. And he did. This was an important and very obvious manifestation of his personality. Being almost a daily visitor, I was a regular observer of little children playing on the lawn where he promenaded or rested on an easy chair in the evenings. The children may be his nieces and nephews, or the children of the neighbours. My own little brother has also played around there. He would offer them sweets, toffees and biscuits which were always handy, and a smile from them was the greatest gift for him. No matter how tired he was, a smile from a child imparted all the relaxation he needed. A smiling photograph of a niece when a kid, had a pride of place on his massive desk amid books and files.

Perhaps one of the greatest joys in human creativity is music. To date perhaps he remains the greatest connoisseur of south-Asian classical music in his generation. The great musicians of the day became self-conscious or were inspired by his presence among the audience. I have had a chance of watching their mutual communication, the performer and the listener, sharing the delicate nuances of musical notes and a lot more. Many participants will recall that the annual conventions of Tolu-e-Islam were, without fail, concluded with a musical session. I have listened to the great Umrao Bundu Khan on the historical lawns of his home; also Mahdi Hassan during his pre-cinema phase and Nazeer Farooqi's rendering of Iqbal's poetry. Perhaps very few would be aware about Kundan Lal Saigal's early association with Parwez. These were of course pre-independence days in Delhi. As kids we were very familiar with his songs, for there was hardly a home where his records were not listened to by one and all. With a beautifully melodious voice, I was nevertheless told that he had no classical training. But he had a prolonged opportunity of listening to it at great length in Parwez's house in Delhi. I was taken aback when I learnt about this close association. Saigal's inborn talent and a good memory enabled him to reproduce the classic musical notes he had listened to. At some stage someone from Bollywood heard him and invited him to join the Bombay Talkies. While deciding to go, Parwez advised him to remain firm and steadfast in the atmosphere prevalent in such ventures. Admirers of Saigal are aware that he faltered and could not keep up with Parwez's advice. Once when a common friend told Saigal that Parwez missed him and that he should go and meet him, he replied; "How can I face him?"

One of the singers that Parwez admired most was Roshan Ara Begum. The latter too was thrilled if Parwez happened to be among the audience, someone who could genuinely and truly appreciate her greatness as a singer. She was already an accomplished artist in the post-independence days. However, as time passed, obscurantist elements in the society, the clerics, carried an on-going propaganda against music and other creative activities as un-Islamic. I remember reading in a local daily newspaper a letter by Roshan Ara Begum saying that she had decided to stop singing because it was un-Islamic. There were spate of letters from desperate readers from Pakistan, Afghanistan and India, begging her not to do so. In one of her replies she stated that when she tries to practice ('riaz'), the guilt that has been imparted by the clerical propaganda, throttles her voice and she cannot sing. Being a simple, honest Muslim, she psychologically submitted to it. I can say with confidence that Parwez alone could have convinced her that music is supreme of all arts and part of Divine creation. There is music everywhere—in the universe above and under the ocean below. Music could never be un-Islamic. So lovers of music got together, and a

JOY OF LIFE

By

Ms. Shamim Anwar

It was way back in early 1958 when Parwez moved to Lahore from Karachi, that I had a chance to talk to him at length. Prior to that it had been a question-answer correspondence with him since 1956. At the time I was a young rebel, up in arms against the inhibited, repressed, psychotic and perverted priesthood to whom anything beautiful, creative or new was blasphemy. The words "haram" and "hell" filled the air, making life ugly and meaningless. It was in such an atmosphere and state of mind that talking to Parwez, a "scholar of the Quran" (a term that I equated with "mullahism") became a red-letter day in my life. The fact is that any sign or shadow of "ghutton" (an Urdu term difficult to express in English except as "inhibition") in him would have made me run. But I stayed on, never to leave.

Parwez was an open-hearted, open-minded and an uninhibited person, full of laughter and good cheer. Even today my mind reverberates with it, that sound of laughter coming from the core and depth of his being and charging the atmosphere with its genuiness and humanity. Naturally, such a laughter cannot be disassociated from a sense of humour. He could see the funny side of life without any bitterness. He could connect things and see through the contradictions to the utter amusement of those around, be they his listeners or the avid readers of his books. Thus in whatever capacity one met him or observed him, the joy of life was the super-interaction. All the mystifying and the dusty impositions were wiped of.

Anyone who can enjoy life and throw out the bitterness must love children. And he did. This was an important and very obvious manifestation of his personality. Being almost a daily visitor, I was a regular observer of little children playing on the lawn where he promenaded or rested on an easy chair in the evenings. The children may be his nieces and nephews, or the children of the neighbours. My own little brother has also played around there. He would offer them sweets, toffees and biscuits which were always handy, and a smile from them was the greatest gift for him. No matter how tired he was, a smile from a child imparted all the relaxation he needed. A smiling photograph of a niece when a kid, had a pride of place on his massive desk amid books and files.

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL® AND QUAID-E-AZAM®

R.L.No. CPL-22
VOL:55
ISSUE 07

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, PAKISTAN
Phone: 5714546, 5753666 Fax: 5866617
Email: idara@toluislam.com
Web Site: http://www.toluislam.com/

AMBER Range of Products:

Capacitors for Motor Start-Run, Fans, Blowers, Air Conditioners, Fluorescent Lamps, High Pressure/High Intensity Discharge Lamps, and, Power Factor Correction.

CUSTOMER SPECIFICATIONS ARE WELCOME!!

Amber Capacitors Limited
16-Link Mcleod Road, P. O. Box 468, Lahore, PAKISTAN.

Phone: +92 42 722 5865, 722 6975
Fax: +92 42 723 2807, 586 6617
Web Site: http://ambercaps.com/
Email: amber@ambercaps.com